شذرات

لیلۃ القدر	منظور الحسن	۲

قرآنیات

النساء (۴: ۹۱-۱۰۴)	جاوید احمد غامدی	۷

معارف نبوی

انصار کی عورتوں سے بیعت لینے کے بارے میں ایک روایت	معز امجد	۱۹

نقطۂ نظر

قاہرہ میں چند روز ـــــ علمی مشاہدات	پروفیسر خورشید عالم	۲۱

سیر و سوانح

عمر فاروق رضی اللہ عنہ (۷)	محمد وسیم اختر مفتی	۳۱

مقامات

قافلہ در قافلہ	جاوید احمد غامدی	۳۹

یسئلون

متفرق سوالات	محمد رفیع مفتی / طالب محسن	۴۹

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

منظور الحسن

لیلۃ القدر

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اللہ تعالیٰ نے نظام زندگی کو شام وسحر، روز وشب اور ماہ وسال کے اعتبار سے تشکیل دیا ہے۔ یہ نظام اس کی عظیم حکمت کا آئینہ دار ہے۔ جہاں اس نے انسانوں کو ان اعتبارات کے لحاظ سے زندگی بسر کرنے کا شعور دیا ہے، وہاں اپنی قدرت، اپنی رحمت اور اپنی برکت کو اس دنیا سے متعلق کرنے کے لیے بھی انھی کو ملحوظ رکھا ہے۔ چنانچہ اس نے لازمی عبادات کے خاص اوقات اور خاص ایام مقرر کیے ہیں اور بعض موقعوں کو اپنی عنایتوں کے حوالے سے نہایت اہم قرار دیا ہے۔ انھی میں سے ایک موقع ماہ رمضان اور اس کے اندر لیلۃ القدر ہے۔ لیلۃ القدر کو قرآن مجید نے مبارک رات سے تعبیر کیا ہے۔ اس رات کی برکت وفضیلت کے حوالے سے جو باتیں قرآن وحدیث سے معلوم ہوتی ہیں، ان کا خلاصہ ہم یہاں بیان کر دیتے ہیں۔

قرآن مجید کا نزول

قرآن مجید لیلۃ القدر میں نازل ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل کیا۔'' (القدر ۹۷:۱)

سورۂ دخان میں فرمایا ہے:

''ہم نے اس (قرآن) کو ایک نہایت مبارک رات میں اتارا ہے۔'' (۴۴:۳)

قرآن کے نزول سے اس رات کی نسبت معمولی بات نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عالم کے پروردگار نے

انسانوں کو ابدی رہنمائی سے فیض یاب کرنے کے لیے اس رات کا انتخاب کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا منشا تھا کہ اس کا کلام نہایت محفوظ طریقے سے انسانوں تک پہنچے۔ چنانچہ اس نے ہر لحاظ سے اس کی حفاظت کا بندوبست فرمایا۔ اس ضمن میں اس نے آسمان سے زمین تک وہ تمام راستے مسدود کر دیے جن سے شیاطین دراندازی کر سکتے تھے۔

بہر حال قرآن مجید کی حفاظت کے اس عظیم انتظام کی بنا پر انسانوں کو قرآن جیسی عظیم نعمت ملنے کے ساتھ ساتھ یہ موقع بھی میسر آیا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو شیاطین کی تاخت سے بچتے ہوئے اپنے پروردگار کے بے پایاں التفات سے فیض یاب ہوں اور جنت میں اپنے مقام کو محفوظ کر لیں۔

امور دنیا کی تقدیر و تقسیم

قرآن مجید نے اس رات کو لیلۃ القدر سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے مراد فیصلوں والی رات ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس موقع پر امور دنیا کے بارے میں اپنے فیصلوں کو متعین فرماتے اور ان کی روشنی میں کارکنان قضا و قدر کو ذمہ داریاں تفویض کرتے ہیں۔ سورۂ دخان میں ارشاد فرمایا ہے:

''اس رات میں تمام پرحکمت امور کی تقسیم ہوتی ہے، خاص ہمارے حکم سے۔'' (۴۴: ۴)

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''اس کی یہ عظمت و برکت اس وجہ سے ہے کہ اس میں کائنات سے متعلق بڑے بڑے فیصلے ہوتے ہیں۔ جب اس دنیا کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے وہ دن بڑی اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں جن میں وہ اپنے سال بھر کے منصوبے طے کرتی ہیں تو اس رات کی اہمیت کا اندازہ کون کر سکتا ہے جس میں پوری کائنات کے لیے خدائی پروگرام طے ہوتا اور سارے جہان کا فیصلہ ہوتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۹/ ۴۶۷)

فرشتوں اور جبریل امین کا نزول بھی اسی پہلو سے ہے۔ فرمایا ہے:

''اس میں فرشتے اور روح الامین اترتے ہیں، ہر معاملے میں، اپنے پروردگار کی اجازت سے۔'' (القدر ۹۷: ۴)

مراد یہ ہے کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کیے گئے امور کو دنیا میں نافذ کرنے کے لیے اترتے ہیں۔ اس موقع پر اللہ کے نہایت مقرب فرشتے حضرت جبریل امین بھی زمین پر اترتے ہیں۔

برکت اور سلامتی کی عظیم رات

سورۂ قدر میں اس رات کی عظمت و برکت کو دو پہلوؤں سے بیان کیا گیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

ایک پہلو سے یہ بات بیان ہوئی ہے کہ: ''یہ رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔''

معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسلوب اس کی برکتوں اور فیض رسانیوں کی کثرت کو بیان کرنے کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ اس سے مقصود انسانوں پر یہ واضح کرنا ہے کہ یہ کوئی عام رات نہیں ہے کہ اسے سو کر گزار دیا جائے، بلکہ اگر پروردگار کے التفات اور نظر کرم کے حوالے سے دیکھا جائے تو ہزار مہینوں کی ہزاروں راتیں بھی اس کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ استاذ گرامی جناب جاوید احمد غامدی اس آیت کی شرح میں لکھتے ہیں:

''ہزار مہینوں' ـــــ کی تعبیر بیان کثرت کے لیے ہے اور اس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امور مہمہ کی تنفیذ کے ساتھ خاص ہونے کی وجہ سے جو رحمتیں، برکتیں اور خدا سے قرب کے جو مواقع اس ایک رات میں حاصل ہوتے ہیں، وہ ہزاروں راتوں میں بھی نہیں ہو سکتے۔'' (البیان ۲۱۵)

دوسرے پہلو سے یہ فرمایا ہے کہ: ''یہ رات سراسر سلامتی ہے، طلوع فجر تک۔''

اس سے مراد یہ ہے کہ اس کے دوران میں اللہ تعالیٰ آفات سماوی کو روک دیتے، شیطانوں کی کارروائیوں پر پابندی لگا دیتے اور انسانوں کے لیے اپنے قرب اور اپنی رحمتوں اور برکتوں کے دروازے کھول دیتے ہیں۔ انھی برکات کے پیش نظر قرآن مجید نے اسے لیلۂ مبارکہ سے بھی تعبیر کیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

لیلۃ القدر کا تعین

قرآن مجید اور احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ لیلۃ القدر ماہ رمضان ہی کی رات ہے، مگر یہ کون سی رات ہے، اس کی تصریح قرآن میں نہیں ہے۔ احادیث سے البتہ یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں سے ایک رات ہے۔ بخاری کی روایت کے مطابق سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لیلۃ القدر کو رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔ بعض روایتوں میں آخری سات دنوں کی صراحت بھی ہے۔ بعض میں صحابۂ کرام کے حوالے سے اکیسویں، تئیسویں اور ستائیسویں رات کے بارے میں قیاسات نقل ہوئے ہیں، بعض میں اکیسویں، تئیسویں اور پچیسویں رات کا ذکر آیا ہے۔ تاہم اس موضوع کی تمام روایتوں پر نظر ڈالنے سے یہی بات سامنے آتی ہے کہ یہ رمضان کی آخری دس راتوں میں سے کوئی طاق رات ہے۔ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لیلۃ القدر کو تلاش کرو رمضان کی آخری دس تاریخوں میں۔ یعنی اکیس یا انتیس کو، تیئس یا ستائیس کو یا پچیس کو۔'' (بخاری)

لیلۃ القدر کی متعین تاریخ نہ بتانے کی حکمت بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ لوگوں کے اندر اس رات کو پانے کی جستجو پیدا ہو۔ اس جستجو میں وہ کئی راتیں عبادت میں گزاریں اور اپنے لیے اجر کا سامان پیدا کریں۔

عبادت کا اہتمام

لیلۃ القدر کی اس عظمت و برکت کو جاننے کے بعد یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ گناہوں کی بخشش کا اس سے بہتر کوئی اور موقع نہیں ہے۔ چنانچہ کسی شخص کو بھی اس کی جستجو سے بے گانہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہر صاحب ایمان کو اپنے پروردگار کی بے پایاں نعمتوں کی طرف متوجہ ہونا چاہیے اور دل کی گہرائیوں سے اس کا شکر بجالانا چاہیے۔ اپنی ضرورتوں اور تمناؤں کو اس کے حضور میں پیش کرنا چاہیے۔ اپنی پریشانیاں اس کے سامنے رکھ کر اس سے صبر کی توفیق طلب کرنی چاہیے اور ان کے تدارک کی درخواست پیش کرنی چاہیے۔ اس موقعے کا بہترین عمل عبادت ہے۔ روایات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرے میں شب و روز کا بیش تر وقت عبادت میں گزارتے تھے۔ سیدہ عائشہ بیان فرماتی ہیں:

''جب رمضان کی آخری دس تاریخیں آتی تھیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کمربستہ ہو جاتے تھے۔ رات رات بھر جاگتے تھے اور اپنے گھر والوں کو بھی جگاتے تھے۔'' (متفق علیہ)

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ النساء

(۱۶)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ، كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا، فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ، وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۹۱﴾

(اِن کے علاوہ) کچھ دوسرے لوگ تم ایسے بھی دیکھو گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی، مگر جب فتنے کی طرف بلائے جاتے ہیں تو اوندھے منہ اُس میں جا گرتے ہیں[۱۵۸]۔ سو اگر وہ تم سے کنارہ نہ کریں اور تمھاری طرف صلح و آشتی کا ہاتھ نہ بڑھائیں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تو اُنھیں جہاں پاؤ، پکڑو اور قتل کرو۔ یہ لوگ ہیں جن کے خلاف ہم نے تمھیں کھلا اختیار[۱۵۹] دیا ہے۔ ۹۱

[۱۵۸] یعنی جب قوم کے سرکشوں کا دباؤ پڑتا ہے تو اُن کی شرارتوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔

[۱۵۹] اصل میں لفظ 'سُلْطَانٌ' آیا ہے۔ اِس کے معنی دلیل و حجت کے بھی ہیں اور یہ اختیار و اقتدار کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اِس دوسرے معنی کی نظیریں سورۂ ابراہیم (۱۴) کی آیت ۲۲ اور سورۂ بنی اسرائیل (۱۷) کی آیت ۳۳ میں دیکھ لی جا سکتی ہیں۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَئًا، وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَئًا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا، فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ، وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ

(لیکن کوئی بے احتیاطی نہیں ہونی چاہیے، اِس لیے کہ) کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی مسلمان کو قتل کرے، الاّ یہ کہ اُس سے غلطی ہو جائے۔ اور جو کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کرے، اُس کے ذمے ہے کہ ایک مسلمان کو غلامی سے آزاد کرے[160] اور اُس کے گھر والوں کو خوں بہا دے[161]، الاّ یہ کہ وہ معاف کر دیں۔ پھر اگر مقتول کسی دشمن قوم سے تعلق رکھتا ہو، مگر مسلمان ہو تو ایک مسلمان کو غلامی سے آزاد کر دینا ہی کافی ہے۔ اور اگر وہ کسی ایسی قوم کا فرد ہے جس کے ساتھ تمھارا معاہدہ ہے

---

[۱۶۰] قرآن نے غلامی کو ختم کرنے کے لیے جو اقدامات کیے، یہ بھی اُنھی میں سے ہے۔ اِس زمانے میں غلامی ختم ہو چکی ہے، لہٰذا کوئی شخص اگر روزے نہ رکھ سکے تو غلام کی قیمت کے تناسب سے قیدیوں کا جرمانہ ادا کر کے وہ اُنھیں رہا کرا سکتا یا اِسی تناسب سے کسی مسلمان کا قرض ادا کر سکتا ہے۔

[۱۶۱] اصل میں 'دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان میں 'دِيَةٌ' کے معنی ہیں: وہ شے جو دیت کے نام سے معروف ہے اور 'دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ' کے الفاظ حکم کے جس منشا پر دلالت کرتے ہیں، وہ اِس کے سوا کچھ نہیں کہ مخاطب کے عرف میں جس چیز کا نام دیت ہے، وہ مقتول کے ورثہ کے سپرد کر دی جائے۔ قرآن مجید نے دیت کی کسی خاص مقدار کا تعین کیا ہے، نہ عورت اور مرد، غلام اور آزاد اور مسلم اور غیر مسلم کی دیتوں میں کسی فرق کی پابندی ہمارے لیے لازم ٹھیرائی ہے۔ اُس کا حکم یہی ہے کہ دیت معاشرے کے دستور اور رواج کے مطابق ادا کی جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت کے فیصلے اپنے زمانے میں عرب کے دستور کے مطابق کیے۔ فقہ و حدیث کی کتابوں میں دیت کی جو مقداریں بیان ہوئی ہیں، وہ اِسی دستور کے مطابق ہیں۔ عرب کا یہ دستور اہل عرب کے تمدنی حالات اور تہذیبی روایات پر مبنی تھا۔ زمانے کی گردش نے کتاب تاریخ میں چودہ صدیوں کے ورق الٹ دیے ہیں۔ تمدنی حالات اور تہذیبی روایات میں زمین و آسمان کا تغیر واقع ہو گیا ہے۔ اب ہم دیت میں اونٹ دے سکتے ہیں، نہ اونٹوں کے لحاظ سے اِس دور میں دیت کا تعین کوئی دانش مندی ہے۔ عاقلہ کی نوعیت بالکل بدل گئی ہے اور قتل خطا کی

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهۡلِهٖ وَتَحۡرِيۡرُ رَقَبَةٍ مُّؤۡمِنَةٍ، فَمَنۡ لَّمۡ يَجِدۡ فَصِيَامُ شَهۡرَيۡنِ مُتَتَابِعَيۡنِ، تَوۡبَةً مِّنَ اللّٰهِ، وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ﴿۹۲﴾ وَمَنۡ يَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ

تو اُس کے وارثوں کو دیت بھی دی جائے گی اور تم ایک غلام بھی آزاد کرو گے۔ پھر جس کے پاس غلام نہ ہو، اُسے لگاتار دو مہینے کے روزے رکھنا ہوں گے۔[۱۶۲] یہ اللہ کی طرف سے اِس گناہ پر توبہ کا طریقہ ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔[۱۶۳] اُس شخص کی سزا، البتہ جہنم ہے جو کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے،

وہ صورتیں وجود میں آ گئی ہیں جن کا تصور بھی اُس زمانے میں ممکن نہیں تھا۔ قرآن مجید کی ہدایت ہر دور اور ہر معاشرے کے لیے ہے، چنانچہ اُس نے اس معاملے میں معروف کی پیروی کا حکم دیا ہے۔ پھر معروف پر مبنی قوانین کے بارے میں یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ حالات اور زمانہ کی تبدیلی سے اُن میں تغیر کیا جا سکتا ہے اور کسی معاشرے کے ارباب حل و عقد اگر چاہیں تو اپنے اجتماعی مصالح کے لحاظ سے اُنھیں نئے سرے سے مرتب کر سکتے ہیں۔

[۱۶۲] اس آیت میں قتل خطا کا جو قانون بیان ہوا ہے، وہ درج ذیل تین دفعات پر مبنی ہے:

اول یہ کہ مقتول اگر مسلمان ہے اور مسلمانوں کی ریاست کا شہری ہے یا مسلمانوں کی ریاست کا شہری تو نہیں ہے، لیکن کسی معاہد قوم سے تعلق رکھتا ہے تو قاتل پر لازم ہے کہ اُسے اگر معاف نہیں کر دیا گیا تو دستور کے مطابق دیت ادا کرے اور اِس جرم کے کفارے میں اپنے پروردگار کے حضور میں توبہ کے لیے ایک مسلمان غلام آزاد کرے۔

دوم یہ کہ وہ اگر دشمن قوم کا کوئی مسلمان ہے تو قاتل پر دیت کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اِس صورت میں یہی کافی ہے کہ اپنے گناہ کو دھونے کے لیے وہ ایک مسلمان غلام آزاد کر دے۔

سوم یہ کہ اِن دونوں صورتوں میں اگر غلام میسر نہ ہو تو اِس کے بدلے میں مسلسل دو مہینے کے روزے رکھے۔

یہ کسی شخص کے غلطی سے قتل ہو جانے کا حکم ہے، لیکن صاف واضح ہے کہ جراحات کا حکم بھی یہی ہونا چاہیے۔ چنانچہ اُن میں بھی دیت ادا کی جائے گی اور اِس کے ساتھ کفارے کے روزے بھی دیت کی مقدار کے لحاظ سے لازماً رکھے جائیں گے۔ یعنی، مثال کے طور پر، اگر کسی زخم کی دیت ایک تہائی مقرر کی گئی ہے تو کفارے کے بیس روزے بھی لازماً رکھنا ہوں گے۔

[۱۶۳] آیت کا یہ حصہ خاص طور پر قابل غور ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

خٰلِدًا فِيۡهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيۡمًا ﴿۹۳﴾
يٰۤـاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا، اِذَا ضَرَبۡتُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوۡا وَلَا تَقُوۡلُوۡا لِمَنۡ اَلۡقٰۤى

وہ اُس میں ہمیشہ رہے گا، اُس پر اللہ کا غضب اور اُس کی لعنت ہے اور اُس کے لیے اُس نے بڑا سخت عذاب تیار کر رکھا ہے[۱۶۴]۔ ۹۲-۹۳

ایمان والو، جب تم اللہ کی راہ میں (اِس جنگ کے لیے) نکلو تو (کسی اقدام سے پہلے) تحقیق کر لیا کرو

’’...جب مفعول اِس طرح فعل کے بغیر آئے تو اُس پر خاص تاکید اور عزم کے ساتھ زور دینا مقصود ہوتا ہے۔ یہاں خوں بہا کے ساتھ ساتھ ایک غلام آزاد کرنے اور غلام آزاد کرنے کی مقدرت نہ ہونے کی صورت میں مسلسل دو مہینے کے روزے رکھنے کی جو ہدایت ہوئی تو اُس پر خاص تاکید کے ساتھ زور دیا کہ یہ خدائے علیم و حکیم کی طرف سے مقرر کردہ توبہ ہے، نہ کوئی اُس کو شاق سمجھے، نہ اُس کی خلاف ورزی کرے۔ قتل مومن، غلطی ہی سے سہی، عظیم گناہ ہے۔ اِس گناہ کو دھونے کے لیے صرف خوں بہا کافی نہیں ہے، بلکہ غلام بھی آزاد کیا جائے اور اگر اِس کی مقدرت نہ ہو تو لگاتار دو مہینے کے روزے رکھے جائیں تاکہ دل پر سے ہر داغ اِس گناہ کا دھل جائے۔ گویا ایسے سنگین معاملے میں زبانی توبہ کافی نہیں ہے، بلکہ اِس کے ساتھ اُس کے مویدات بھی ہونے ضروری ہیں۔‘‘ (تدبر قرآن ۲/ ۳۶۲)

[۱۶۴] یہاں قتل عمد کی جو سزا بیان ہوئی ہے، وہ بعینہٖ وہی ہے جو بدترین منکرین حق کے لیے قرآن میں بیان ہوئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

’’...اِس سزا کی سنگینی کی علت سمجھنے کے لیے اِس امر کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر سب سے بڑا حق اُس کی جان کا احترام ہے، کوئی مسلمان اگر دوسرے مسلمان کی جان لے لیتا ہے تو اِس کے معنی یہ ہوئے کہ حقوق العباد میں سے اُس نے سب سے بڑے حق کو تلف کیا جس کی تلافی و اصلاح کی بھی اب کوئی شکل باقی نہیں رہی، اِس لیے کہ جس شخص کے حق کو اُس نے تلف کیا، وہ دنیا سے رخصت ہو چکا اور حقوق العباد کی اصلاح کے لیے تلافی مافات ناگزیر ہے۔ پھر اِس کا ایک اور پہلو بھی بڑا اہم ہے۔ وہ یہ کہ یہ ایک ایسے مسلمان کے قتل کا معاملہ ہے جو دارالکفر اور دارالحرب میں گھرے ہوئے ہونے کی وجہ سے اسلامی شریعت کے اُن تحفظات سے بھی محروم تھا جو دارالاسلام میں ایک مسلمان کو حاصل ہوتی ہیں۔ اپنے دین اور اپنے نفس کے معاملے میں اُس کو اگر کسی سے خیر کی امید ہو سکتی تھی تو وہ مسلمانوں ہی سے ہو سکتی تھی۔ اب اگر کوئی مسلمان ہی اُس کو قتل کر دے اور وہ بھی عمداً اور ایسی جگہ پر جہاں اُس کو اسلامی قانون کی حفاظت بھی حاصل نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ نہ ایسے مقتول سے بڑھ کر کوئی مظلوم ہو سکتا

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اِلَيۡكُمُ السَّلٰمَ لَسۡتَ مُؤۡمِنًا، تَبۡتَغُوۡنَ عَرَضَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا فَعِنۡدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ
كَثِيۡرَةٌ، كَذٰلِكَ كُنۡتُمۡ مِّنۡ قَبۡلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيۡكُمۡ فَتَبَيَّنُوۡا، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا
تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرًا ﴿٩٤﴾

لَا يَسۡتَوِى الۡقٰعِدُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ غَيۡرُ اُولِى الضَّرَرِ وَالۡمُجٰهِدُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ
اللّٰهِ بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ، فَضَّلَ اللّٰهُ الۡمُجٰهِدِيۡنَ بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ عَلَى
الۡقٰعِدِيۡنَ دَرَجَةً، وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الۡحُسۡنٰى، وَفَضَّلَ اللّٰهُ الۡمُجٰهِدِيۡنَ عَلَى
الۡقٰعِدِيۡنَ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ﴿٩٥﴾ دَرَجٰتٍ مِّنۡهُ وَمَغۡفِرَةً وَّرَحۡمَةً، وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا

اور جو تمھیں سلام کرے، اُسے یہ نہ کہا کرو کہ تم مسلمان نہیں ہو۔ تم دنیوی زندگی کا ساز و سامان چاہتے ہو تو اللہ کے پاس تمھارے لیے بہت کچھ سامان غنیمت ہے۔[165] اِس سے پہلے تم بھی اِسی حالت میں تھے، پھر اللہ نے تم پر احسان کیا۔ اِس لیے تحقیق کر لیا کرو۔ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ ۹۴

(اِس جنگ کے لیے نکلو، اِس لیے کہ) مسلمانوں میں سے جو لوگ کسی معذوری کے بغیر گھروں میں بیٹھے رہیں اور جو اپنے جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کریں، دونوں برابر نہیں ہیں۔ اللہ نے بیٹھنے والوں پر جان و مال سے جہاد کرنے والوں کو ایک درجہ فضیلت دی ہے۔ (اِس میں شبہ نہیں کہ) اِن میں سے ہر ایک کے لیے اللہ نے بھلائی کا وعدہ فرمایا ہے، مگر جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر اللہ نے ایک اجر عظیم کی فضیلت دی ہے، اُس کی طرف سے درجے اور مغفرت اور رحمت۔ اور اللہ بخشنے والا

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ہے اور نہ ایسے قاتل سے بڑھ کر کوئی ظالم!'' (تدبر قرآن ۲/۳۶۱)

[۱۶۵] مطلب یہ ہے کہ مال غنیمت کی طمع میں کسی شخص کے ایمان کا انکار نہ کرو۔ تم یہ جنگ فتوحات حاصل کرنے اور مال غنیمت جمع کرنے کے لیے نہیں، بلکہ مظلوم مسلمانوں کو ظالموں کے پنجے سے چھڑانے کے لیے لڑ رہے ہو۔ خدا کے پاس تمھارے لیے غنیمت کے بڑے ذخیرے ہیں۔ وہ بھی عنقریب تمھیں حاصل ہو جائیں گے، لیکن کسی مسلمان کی جان تمھارے کسی اقدام کی وجہ سے خطرے میں نہیں پڑنی چاہیے۔

رَّحِيۡمًا ﴿۹۶﴾

اِنَّ الَّذِيۡنَ تَوَفّٰهُمُ الۡمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيۡٓ اَنۡفُسِهِمۡ، قَالُوۡا: فِيۡمَ كُنۡتُمۡ، قَالُوۡا كُنَّا مُسۡتَضۡعَفِيۡنَ فِي الۡاَرۡضِ، قَالُوۡٓا: اَلَمۡ تَكُنۡ اَرۡضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوۡا فِيۡهَا، فَاُولٰٓئِكَ مَاۡوٰهُمۡ جَهَنَّمُ وَسَآءَتۡ مَصِيۡرًا ﴿۹۷﴾ اِلَّا الۡمُسۡتَضۡعَفِيۡنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالۡوِلۡدَانِ لَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ حِيۡلَةً وَّلَا يَهۡتَدُوۡنَ سَبِيۡلًا ﴿۹۸﴾

ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔[۱۶۶] ۹۵-۹۶

(اِس موقع پر بھی جو لوگ اُن بستیوں سے نکلنے کے لیے تیار نہیں ہیں، جہاں اُنھیں دین کے لیے ستایا جا رہا ہے، اُنھیں بتاؤ، اے پیغمبر کہ) جن لوگوں کی جان فرشتے اِس حال میں قبض کریں گے کہ[۱۶۷] (اپنے ایمان کو خطرے میں ڈال کر) وہ اپنی جان پر ظلم کر رہے تھے، اُن سے وہ پوچھیں گے کہ یہ تم کس حال میں پڑے رہے؟ وہ جواب دیں گے کہ ہم تو اِس ملک میں بالکل بے بس تھے۔ فرشتے کہیں گے: کیا خدا کی زمین ایسی وسیع نہ تھی کہ تم اُس میں ہجرت کر جاتے۔ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔[۱۶۸] ہاں، وہ مرد، عورتیں اور بچے جو فی الواقع بے بس ہیں اور نہ کوئی تدبیر کر سکتے ہیں نہ راستہ پاتے ہیں،

---

[۱۶۶] یہ مظلوم مسلمانوں کی مدد کے لیے ایک مرتبہ پھر جہاد کی ترغیب دی ہے، لیکن اُس وقت چونکہ نفیر عام کا موقع نہیں تھا، اِس لیے وضاحت کر دی ہے کہ اِس کی حیثیت ایک درجۂ فضیلت کی ہے۔ سچے مسلمان اگر کسی عذر معقول کے بغیر بھی اِس کے لیے نہیں اٹھیں گے تو جہاد کے اجر عظیم سے تو یقیناً محروم رہیں گے، مگر خدا کا وعدہ اُن سے بھی اچھا ہے۔ وہ جہاد سے جی چرانے والے منافقین نہیں ہیں، لہٰذا اپنے اخلاص اور حسن عمل کا اجر ضرور پائیں گے۔

[۱۶۷] اصل الفاظ ہیں: 'اِنَّ الَّذِيۡنَ تَوَفّٰهُمُ الۡمَلٰٓئِكَةُ'۔ ان میں لفظ 'الۡمَلٰٓئِكَةُ' جمع ہے۔ اِس سے مقصود یہاں جنس کا اظہار ہے۔ عربی زبان میں جمع بعض موقعوں پر اِس طریقے سے بھی آتی ہے۔

[۱۶۸] یہ وعید اِس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہجرت کے مطالبے کے باوجود یہ لوگ محض اپنے مفادات کی خاطر گریز و فرار کے بہانے تراش رہے تھے اور اس طرح گویا ایک طرح کی منافقت میں مبتلا تھے۔ چنانچہ پیچھے اِسی بنا پر اُنھیں منافق کہا گیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ، وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿٩٩﴾ وَمَنْ
يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً، وَمَنْ يَّخْرُجْ
مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى
اللّٰهِ، وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿١٠٠﴾

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ،
اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا، اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿١٠١﴾

اُن کے لیے توقع ہے کہ اللہ اُن سے درگزر فرمائے۔ بے شک، اللہ معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے۔ (یہ لوگ گھروں سے نکلیں اور مطمئن رہیں کہ) جو اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا، وہ زمین میں پناہ کے لیے بڑے ٹھکانے اور بڑی گنجایش پائے گا۔ اور جو اپنے گھر سے اللہ اور اُس کے رسول کی طرف ہجرت کے لیے نکلے، پھر اُسے موت آجائے تو اُس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہو گیا اور اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔[۱۶۹] ۹۷-۱۰۰

تم لوگ (اِس جہاد کے لیے) سفر میں نکلو تو کوئی حرج نہیں کہ نماز میں کمی کر لو، اگر اندیشہ ہو کہ منکرین تمھیں ستائیں گے، اِس لیے کہ یہ منکرین تمھارے کھلے دشمن ہیں۔[۱۷۰] ۱۰۱

---

[۱۶۹] ان آیتوں سے واضح ہے کہ بندۂ مومن کے لیے اگر کسی جگہ اپنے پروردگار کی عبادت پر قائم رہنا جان جوکھم کا کام بن جائے، اُسے دین کے لیے ستایا جائے، یہاں تک کہ اپنے اسلام کو ظاہر کرنا ہی اُس کے لیے ممکن نہ رہے تو ایمان کا تقاضا ہے کہ اُس جگہ کو چھوڑ کر وہ کسی ایسے مقام کی طرف منتقل ہو جائے جہاں وہ علانیہ اپنے دین پر عمل پیرا ہو سکے۔

[۱۷۰] اِس سے نماز کی اہمیت واضح ہوتی ہے کہ جنگ کے خطرات میں بھی کوئی مسلمان اُسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ سورۂ بقرہ میں بیان ہو چکا ہے کہ خطرہ ہو تو نماز پیدل چلتے ہوئے یا سواری پر، جس طرح ممکن ہو پڑھ لی جائے۔ یہاں فرمایا ہے کہ حالات کے لحاظ سے اِس میں کمی بھی ہو سکتی ہے۔ اصطلاح میں اِسے قصر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس کے لیے یہ سنت قائم کی ہے کہ صرف چار رکعت والی نمازیں دو رکعت پڑھی

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

وَاِذَا كُنۡتَ فِيۡهِمۡ فَاَقَمۡتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلۡتَقُمۡ طَآئِفَةٌ مِّنۡهُمۡ مَّعَكَ وَلۡيَاۡخُذُوۡۤا اَسۡلِحَتَهُمۡ، فَاِذَا سَجَدُوۡا فَلۡيَكُوۡنُوۡا مِنۡ وَّرَآئِكُمۡ وَلۡتَاۡتِ طَآئِفَةٌ اُخۡرٰى لَمۡ يُصَلُّوۡا فَلۡيُصَلُّوۡا مَعَكَ وَلۡيَاۡخُذُوۡا حِذۡرَهُمۡ وَاَسۡلِحَتَهُمۡ، وَدَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لَوۡ تَغۡفُلُوۡنَ عَنۡ اَسۡلِحَتِكُمۡ وَاَمۡتِعَتِكُمۡ فَيَمِيۡلُوۡنَ عَلَيۡكُمۡ مَّيۡلَةً وَّاحِدَةً،

اور (اے پیغمبر)، جب تم اِن کے درمیان ہو اور (خطرے کی جگھوں پر) اِنھیں نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہو تو چاہیے کہ ایک گروہ تمھارے ساتھ کھڑا ہو اور اپنا اسلحہ لیے رہے۔ پھر جب وہ سجدہ کر چکیں تو تمھارے پیچھے ہو جائیں اور دوسرا گروہ آئے، جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے اور تمھارے ساتھ نماز ادا کرے۔ وہ بھی اپنی حفاظت کا سامان اور ضروری اسلحہ لیے ہوئے ہوں۔ یہ منکر تو چاہتے ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان سے ذرا غافل ہو تو تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں۔ اِس میں، البتہ

جائیں گی۔ دو اور تین رکعت والی نمازوں میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ چنانچہ فجر اور مغرب کی نمازیں اِس طرح کے موقعوں پر بھی پوری پڑھیں گے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ فجر پہلے ہی دو رکعت ہے اور مغرب دن کے وتر ہیں، اِن کی یہ حیثیت تبدیل نہیں ہو سکتی۔

نماز میں کمی کی یہ رخصت یہاں 'اِنۡ خِفۡتُمۡ' (اگر تمھیں اندیشہ ہو) کی شرط کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے کے عام سفروں کی پریشانی، افراتفری اور آپا دھاپی کو بھی اِس پر قیاس فرمایا اور ان میں بالعموم قصر نماز ہی پڑھی ہے۔ سیدنا عمر کا بیان ہے کہ اِس طرح بغیر کسی خطرے کے قصر کر لینے پر مجھے تعجب ہوا۔ چنانچہ میں نے پوچھا تو آپ نے فرمایا: یہ اللہ کی عنایت ہے جو اُس نے تم پر کی ہے، سو اللہ کی اس عنایت کو قبول کرو۔*

نماز میں تخفیف کی اِس اجازت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کے اوقات میں تخفیف کا استنباط بھی کیا ہے اور اِس طرح کے سفروں میں ظہر و عصر، اور مغرب اور عشا کی نمازیں جمع کر کے پڑھائی ہیں۔** یہی معاملہ حج کا

---

* مسلم، رقم ۶۸۶۔

** ابوداؤد، رقم ۱۲۲۰۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ اِنۡ كَانَ بِكُمۡ اَذًى مِّنۡ مَّطَرٍ اَوۡ كُنۡتُمۡ مَّرۡضٰۤى اَنۡ تَضَعُوۡۤا اَسۡلِحَتَكُمۡ وَ خُذُوۡا حِذۡرَكُمۡ، اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَذَابًا مُّهِيۡنًا﴿۱۰۲﴾

کوئی حرج نہیں کہ اگر بارش کی تکلیف محسوس کرو یا بیمار ہو تو اپنا اسلحہ اتار دو۔ ہاں، یہ ضروری ہے کہ حفاظت کا سامان لیے رہو۔ تم یقین رکھو کہ اللہ نے اِن منکروں کے لیے بڑی ذلت کی سزا تیار کر رکھی ہے[۱۷۱]۔۱۰۲

ہے۔ اِس میں چونکہ شیطان کے خلاف جنگ کو علامتوں کی زبان میں ممثل کیا جاتا ہے، اِس لیے تمثیل کے تقاضے سے آپ نے یہ سنت قائم فرمائی ہے کہ لوگ مقیم ہوں یا مسافر، وہ منیٰ میں قصر اور مزدلفہ اور عرفات میں جمع اور قصر، دونوں کریں گے۔

[۱۷۱] یہ ایک مشکل کا حل ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حین حیات اگر خطرے کے موقعوں پر نماز کی جماعت کھڑی کی جائے اور حضور امامت کرائیں تو کوئی مسلمان اُس جماعت کی شرکت سے محروم رہنے پر راضی نہیں ہو سکتا تھا۔ ہر سپاہی کی یہ آرزو ہوتی کہ وہ آپ ہی کی اقتدا میں نماز ادا کرے۔ یہ آرزو ایک فطری آرزو تھی، لیکن اِس کے ساتھ دفاع کا اہتمام بھی ضروری تھا۔ اِس مشکل کا ایک حل تو یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود چار رکعتیں پڑھتے اور اہل لشکر دو حصوں میں تقسیم ہو کر دو دو رکعتوں میں آپ کے ساتھ شامل ہو جاتے۔ بعض موقعوں پر یہ طریقہ اختیار کیا بھی گیا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اِس میں جو زحمت ہو سکتی تھی، اِس کے پیش نظر قرآن نے اِن آیتوں میں یہ تدبیر بتائی کہ امام اور مقتدی، دونوں قصر نماز ہی پڑھیں اور لشکر کے دونوں حصے یکے بعد دیگرے آپ کے ساتھ آدھی نماز میں شامل ہوں اور آدھی نماز اپنے طور پر ادا کر لیں۔ چنانچہ ایک حصہ پہلی رکعت کے سجدوں کے بعد پیچھے ہٹ کر حفاظت و نگرانی کا کام سنبھالے اور دوسرا حصہ، جس نے نماز نہیں پڑھی ہے، آپ کے پیچھے آ کر دوسری رکعت میں شامل ہو جائے۔

روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس حکم کی رو سے لشکر کو جو رکعت اپنے طور پر ادا کرنا تھی، اُس کے لیے حالات کے لحاظ سے مختلف طریقے اختیار کیے گئے۔ ایسا بھی ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توقف فرمایا اور لوگ نماز پوری کر کے پیچھے ہٹے اور ایسا بھی ہوا کہ اُنھوں نے بعد میں نماز پوری کر لی*۔ اِس کی تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت اب باقی نہیں رہی۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس تدبیر کا تعلق، جیسا کہ آیت میں 'وَاِذَا كُنۡتَ فِيۡهِمۡ' (اور جب تم اُن کے

* بخاری، رقم ۳۹۰۰۔ مسلم، رقم ۸۴۲۔

فَـاِذَا قَـضَيۡتُـمُ الصَّلٰوةَ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰى جُنُوۡبِكُمۡ، فَاِذَا اطۡمَاۡنَنۡتُمۡ فَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ، اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتۡ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ كِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا ﴿١٠٣﴾
وَلَا تَهِـنُـوۡا فِـى ابۡتِـغَـآءِ الۡقَوۡمِ، اِنۡ تَكُوۡنُوۡا تَاۡلَمُوۡنَ فَاِنَّهُمۡ يَاۡلَمُوۡنَ كَمَا

پھر جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہوئے، (ہر حال میں) یاد کرتے رہو۔[172] لیکن جب اطمینان میں ہو جاؤ تو پوری نماز پڑھو (اور اِس کے لیے جو وقت مقرر ہے، اُس کی پابندی کرو)، اِس لیے کہ نماز مسلمانوں پر وقت کی پابندی کے ساتھ فرض کی گئی ہے۔[173] ۱۰۳

(ایمان والو، اِس جنگ کے لیے نکلو) اور دشمن[174] کے تعاقب میں کمزوری نہ دکھاؤ۔ اگر تم تکلیف اٹھا رہے ہو تو تمھاری طرح وہ بھی تکلیف اٹھا رہے ہیں، لیکن تم خدا سے وہ توقعات رکھتے ہو جو وہ نہیں

درمیان ہو) کے الفاظ سے واضح ہے، خاص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی سے تھا۔ آپ کے بعد کسی ایک ہی امام کی اقتدا کی خواہش نہ اتنی شدید ہو سکتی ہے اور نہ اُس کی اتنی اہمیت ہے۔ قیام جماعت کا موقع ہو تو لوگ اب الگ الگ اماموں کی اقتدا میں نہایت آسانی کے ساتھ نماز ادا کر سکتے ہیں۔

[۱۷۲] نماز کی اصل حقیقت ذکر الٰہی ہے اور دین کی روح اِس ذکر کا دوام ہے۔ قصر کی اجازت سے اِس میں جو کسر ہوئی تھی۔ یہ اُس کے جبر کی ہدایت فرمائی ہے کہ میدان جنگ میں اور خطرے کے موقعوں پر بالخصوص اِس کا اہتمام کیا جائے، اِس لیے کہ تمام عزم و حوصلہ کا منبع درحقیقت اللہ تعالیٰ کی یاد ہی ہے۔

[۱۷۳] نماز کے اوقات میں تخفیف کی طرف یہ قرآن نے خود اشارہ کر دیا ہے۔ آیت میں 'اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتۡ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ كِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا' کے الفاظ عربیت کی رو سے تقاضا کرتے ہیں کہ اِن سے پہلے 'اور وقت کی پابندی کرو' یا اِس طرح کا کوئی جملہ مقدر سمجھا جائے۔ اِس سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہوئی کہ قصر کی اجازت کے بعد یہ بھی ممکن ہے کہ لوگ نماز کی رکعتوں کے ساتھ اُس کے اوقات میں بھی کمی کر لیں۔ چنانچہ ہدایت کی گئی کہ جب اطمینان میں ہو جاؤ تو پوری نماز پڑھو اور اُس کے لیے جو اوقات مقرر ہیں، اُن کی پابندی کرو، اِس لیے کہ نماز مسلمانوں پر وقت کی پابندی کے ساتھ فرض کی گئی ہے۔

[۱۷۴] اصل میں لفظ 'الۡقَوۡم' آیا ہے۔ یہ جب اِس طرح کے سیاق میں آتا ہے تو اِس سے مراد دشمن اور حریف ہوتا ہے۔ اِس کی مثالیں قرآن مجید اور کلام عرب، دونوں میں موجود ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

تَاْلَمُوْنَ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ، وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۰۴﴾

رکھتے، اور اللہ علیم و حکیم ہے۔[175] ۱۰۴

[175] لٰہذا مطمئن رہو۔ تمھیں جو تکلیف بھی پہنچتی ہے تمھاری مصلحت کے لیے پہنچتی ہے اور خدا کے اِسی علم و حکمت کا تقاضا ہوتی ہے۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

معز امجد

انصار کی عورتوں سے بیعت لینے کے بارے میں ایک روایت

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

روایت کا مضمون

احمد بن حنبل، رقم ۶۸۵۰ کے مطابق روایت ہے کہ:

جاء ت أميمة بنت رقيقة إلى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم تبايعه على الإسلام فقال أبايعك على ان لا تشركى باللّٰه شيئا ولا تسرقى ولا تزنى ولا تقتلى ولدك ولا تأتى ببهتان تفترينه بين يديك ورجليك ولا تنوحى ولا تبرجى تبرج الجاهلية الأولى.

امیمہ بنت رقیقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اسلام کی بیعت کرنے آئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تم سے بیعت لیتا ہوں اس بات پر کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرو گی؛ چوری نہیں کرو گی؛ زنا نہیں کرو گی؛ اپنی اولاد کو قتل نہیں کرو گی؛ تم اپنے پوشیدہ اعضا کے بارے میں کسی پر بہتان نہیں لگاؤ گی اور نہ تم نوحہ کرو گی اور نہ بے حیائی کا برتاؤ کرو گی، جیسا کہ دور جاہلیت میں ہوتا رہا۔

روایت پر تبصرہ

اس روایت کو عمرو بن شعیب نے اپنے والد سے اور اس کے والد نے اپنے والد سے روایت کیا ہے۔ اس سند

کے بارے میں مثبت و منفی، دونوں قسم کی آرا پائی جاتی ہیں۔ اکثر اہل علم کے نزدیک عمرو بن شعیب کا اپنے والد اور اپنے دادا سے روایت کرنا قابل بھروسا نہیں ہے[1]۔

اس روایت کے متن کے بارے میں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اس میں بعض ایسے جملوں کا اضافہ ہے جو اسی موضوع کی دوسری روایات میں نقل نہیں ہوئے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خواتین سے جو بیعت لیا کرتے تھے اس کا حوالہ قرآن مجید میں بھی ہے اور اس کی رو سے بھی زیر بحث روایت میں بعض جملوں مثلاً ''تم نوحہ نہیں کرو گی'' کا اضافہ ہے۔ قرآن مجید میں بیعت کا ذکر اس طرح سے ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِىُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِىْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ. (الممتحنہ ۶۰:۱۲)

''اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) جب تمھارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے لیے آئیں اور اس بات کا عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی، اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی، کسی امر معروف میں تمھاری نافرمانی نہ کریں گی تو تم ان سے بیعت لے لو اور ان کے حق میں دعاے مغفرت کرو۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

نتیجۂ بحث

اس روایت پر مذکورہ بالا اعتراضات کے بعد ہم یہ بات اعتماد کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بیعت لینے کا واقعہ اسی طرح ہوا ہوگا، جیسا کہ یہ روایت ہوا ہے۔

تخریج: محمد اسلم نجمی

کوکب شہزاد

ترجمہ و ترتیب: اظہار احمد

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے: خلاصۂ تہذیب التہذیب ۱/ ۲۹۰، الجرح والتعدیل ۶/ ۲۳۸، الضعفاء والمتروکین ۲/ ۲۲۷، الکامل فی ضعفاء الرجال ۵/ ۱۱۴، المجروحین ۲/ ۷۱، تہذیب التہذیب ۴/ ۳۱۱، تہذیب الکمال ۱۲/ ۵۳۴، طبقات المدلسین ۱/ ۳۴۔

پروفیسر خورشید عالم

قاہرہ میں چند روز ـــــ علمی مشاہدات

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ـــــ ۱ ـــــ

عربی زبان کا طالب علم ہونے کے ناتے دیرینہ تمنا تھی کہ اس دیس کو دیکھوں جس کے باسی پراسرار تصویری خط ہیروغلیفی (Hieroglyphic) لکھنے والے جب حلقۂ بگوش اسلام ہوئے تو عربی زبان و ادب کے اس قدر گرویدہ ہوئے کہ اس کی قیادت کا سہرا ان کے سر بندھا اور اس زبان کا واحد نوبل پرائز قاہرہ کے ادیب نجیب محفوظ کو ملا۔

یہ دیرینہ تمنا اپنے بیٹوں بالخصوص بڑے بیٹے کی معاونت سے بر آئی۔ چنانچہ میں اور میری بیوی عرب امارات کی پرواز کے ذریعہ سے لاہور سے صبح نو بجے روانہ ہو کر ساڑھے گیارہ بجے دبئی پہنچے۔ وہاں سے تین بج کر پچاس منٹ پر روانہ ہوئے اور پانچ بج کر پچیس منٹ پر قاہرہ کے ہوائی اڈے پر پہنچے۔ ہوائی اڈہ کی عالی شان عمارت پر سورۂ یوسف کی آیت ۹۹ 'اُدْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ' لکھی دیکھ کر جی بہت خوش ہوا۔ حضرت یوسف نے اپنے والدین اور بھائیوں سے کہا: سب مصر میں داخل ہو جاؤ، اللہ کو منظور رہا تو سب امن چین سے رہیں گے۔ پاکستان اور دبئی کے وقت میں دو گھنٹے کا فرق ہے اور پاکستان اور قاہرہ کے وقت میں تین گھنٹے کا۔

ہوائی اڈے پر سیر و سیاحت کی ایجنسی ''الجزیرہ'' کا مصری نمائندہ ہمیں لینے آیا ہوا تھا۔ امیگریشن اور سیکیورٹی کی کارروائی کو وہ شتابی سے نمٹا کر ہمیں ہوائی اڈے سے باہر لے گیا اور گاڑی میں بٹھا کر ہوٹل کی طرف رواں دواں

ہوا۔ پریذیڈنٹ ہوٹل حی الزمالک شارع ڈاکٹر طٰہٰ حسین پر ہوائی اڈے سے اکتیس کلومیٹر دور ہے۔ قاہرہ میں حی الزمالک اسی طرح معروف ہے جس طرح شارع ڈاکٹر طٰہٰ حسین اور طٰہٰ حسین، زبان پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا، عربی ادب کا سرخیل، عربی نثر میں سہل ممتنع کا امام، مصر کا نابینا وزیر تعلیم جس کے خلاف طلبا نے احتجاج کیا کہ ہمیں اندھا وزیر نہیں چاہیے تو ان سے مخاطب ہو کر ایک تاریخی جملہ ان کے منہ سے نکلا: 'الحمد لله الذی جعلنی الأعمی کی لا انظر أشکال امثالکم'، ''شکر ہے اس اللہ کا جس نے مجھے اندھا بنایا کہ تمھارے جیسوں کی شکلیں نہ دیکھ سکوں۔''

سیاحت کی تفصیل سے پہلے مصر اور قاہرہ کے بارے میں مختصر سے تاریخی حوالے دینا مناسب رہے گا۔

مصر

مسعودی ''مروج الذہب'' (۱/۳۵۷) میں کہتا ہے کہ حضرت نوح کے پوتے بیصر بن حام کا کنبہ جب بڑا ہو گیا تو انھوں نے بابل کی سرزمین چھوڑ کر مغرب کا رخ کیا۔ بیصر کے بڑے بیٹے مصر بن بیصر بن حام بن نوح نے مقام منف پر پڑاؤ کیا اور ان کے نام پر مصر کا نام پڑا۔ ممفس (منف) (Memphis) قدیم فراعنہ کے زمانے میں مصر کا پہلا دارالحکومت تھا۔ یہ نیل کے ڈیلٹا کے جنوب میں دریا کے مغربی کنارے پر واقع تھا۔ جیزہ کے مشہور اہرام اور ابوالہول اسی جگہ پر واقع ہیں جس جگہ پر آج ابورواش، زاویۃ الأریان، ابومیر، سقارہ اور دھشور کے اہرام ہیں، وہاں پر ممفس آباد تھا۔ اب میت رھینہ کی بستی کے قریب اس کے کھنڈرات ہیں۔ فراعنہ کے پہلے چھ خاندانوں کے دور میں یہ شہر خوب پھلا پھولا۔ اسے پہلے فرعون مینا (Menes) نے تعمیر کیا جس کا عہد حکومت پانچ ہزار قبل از مسیح ہے۔ ممفس چھٹے خاندان کی ابتدا تک خوب پھلا پھولا، پھر عہد وسطیٰ میں نئے دارالحکومت طیبہ نے اس کی جگہ لے لی۔

طیبہ

(Thebes) ۳۰۶۷ تا ۱۷۰۳ قبل از مسیح فراعنہ کا دور متوسط کہلاتا ہے۔ اس دور میں چرواہے بادشاہ (Hyksos) مصر پر غالب رہے۔ انھوں نے گیارھویں خاندان سے لے کر ستارھویں خاندان تک حکومت کی۔ نویں اور دسویں خاندان کی حکومت کے دوران میں مرکز ثقل زیریں مصر یعنی ممفس سے تبدیل ہو کر بالائی مصر یعنی طیبہ منتقل ہو گیا۔ بارھویں خاندان نے طیبہ (موجودہ نام الاقصر 'Luxor') میں آثار کی تعمیر کا سلسلہ شروع کیا تو دارالحکومت یہاں منتقل ہو گیا۔ طیبہ قاہرہ کے جنوب میں ۴۱۹ میل کی مسافت پر دریاے نیل کے دونوں کناروں پر واقع تھا۔ یہاں پر

امون (Amon) دیوتا کا شان دار معبد تھا۔ دریا کے دوسرے کنارے کرنک کا معبد تھا۔

توت انخ امون (Tutanakhamun)، سیتی اول (Seti I)، رمسیس ثانی (Rumesis II) جیسے جدید فراعنۂ مصر کے دور تک طیبہ کی شان وشوکت بحال رہی، مگران کے زمانہ میں دو دارالحکومت بن گئے۔ جنوب میں طیبہ اور شمال میں ممفس۔ رمسیس ثانی کے زمانہ سے طیبہ زوال پذیر ہوگیا اور ممفس باقاعدہ مصر کا دارالحکومت بن گیا۔ بنواسرائیل کے خروج کے وقت یہی دارالحکومت تھا۔ وہ اسی کے قریب گوشن (Ghoshen) نامی شہر میں آباد تھے۔

بابل الجدید

اہل فارس نے ۵۲۷ قبل از مسیح قمبیز (Cambyses) کی قیادت میں مصر پر قبضہ کیا اور شمال میں دریاے نیل کے مغربی کنارے ممفس کے قریب بابل نامی شہر آباد کیا، رومانیوں کے عہد حکومت میں یہ شہر صرف بابل نامی قلعہ کی صورت میں باقی تھا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اسکندریہ

۳۳۲ قبل از مسیح میں مقدونیہ کے سکندر اعظم نے مصر پر قبضہ کر کے اسکندریہ کو دارالحکومت بنا دیا۔ اس کے ساتھ ہی ممفس کا زوال شروع ہوگیا۔ مصر کی اسلامی فتح کے وقت قدیم دارالحکومت کی کچھ نہ کچھ اہمیت باقی تھی۔ مقوقس حاکم مصر نے اسلامی لشکر کے ساتھ معاہدہ کیا۔ جب قاہرہ کی بنیاد رکھی گئی تو اس کی مسجد اور محلات کی تعمیر میں ممفس کے آثار کے پتھر استعمال کیے گئے۔ ہر سال دریاے نیل کے سیلاب نے اسی ممفس شہر کے کھنڈرات کو جسے فرعون مینا نے بنایا تھا، رفتہ رفتہ مٹا دیا۔

فسطاط

حضرت عمرو بن العاص نے ۶۳۸ء میں مصر فتح کیا تو دو برس بعد قلعہ کی دیوار کے دامن میں فسطاط (کیمپ) نامی شہر کی بنیاد رکھی۔ یہ نیا دارالحکومت بھی تھا اور فوجی قائدین کی رہایش گاہ بھی۔ احمد بن طولون والی مصر نے عباسی خلیفہ معتمد بن متوکل کے زمانہ میں فسطاط کو مشرق کی جانب وسیع کر کے القطائع (ملکیت) نامی فوجی شہر آباد کر دیا۔ عسکر اور قطائع نامی شہروں کی آبادی کے بعد فسطاط نے اپنی اہمیت کھو دی۔

قاہرہ

۹۶۹ء میں فاطمی خلیفہ معزلدین اللہ کے فوجی قائد جوھر نے فسطاط پر قبضہ کرلیا اور ۳۵۹ھ (۹۷۰ء) میں نئے شہر کی داغ بیل رکھنا شروع کی۔ علمائے فلک کے حساب کے مطابق تعمیر کا کام اس زمانہ میں شروع ہوا جب مریخ سیارہ طلوع ہوتا ہے، مریخ کو عربی میں القاھر (زبردست۔ کامیاب) کہا جاتا ہے۔ اس لیے نئے شہر کا نام القاھرہ رکھا گیا اور وہ اس وقت سے لے کر اب تک مصر کا دارالحکومت ہے۔ آپ نے دیکھا کہ مرور ایام کے ساتھ ساتھ مصر کے دارالحکومت بدلتے رہے۔

---

۱۰ دسمبر ۲۰۰۶ ''الجزیرۃ'' ٹریول ایجنسی کا نمائندہ صبح دس بجے ہوٹل میں موجود تھا۔ اس کے ساتھ قاہرہ کے سیر و سیاحت کالج کا گریجویٹ ایک قبطی نوجوان مائیکل بطور گائیڈ تھا۔ وہ ہمیں حی التحریر میں واقع مصری عجائب گھر لے گیا۔ عجائب گھر کی عمارت پرشکوہ تھی جس کے باہر دنیا بھر سے آئے ہوئے سیاحوں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ اس عجائب گھر میں صرف فراعنۂ مصر کے مجسمے، دیگر یادگاریں اور حنوط شدہ لاشے ہیں۔ گائیڈ نے اندر داخل ہونے سے پہلے عجائب گھر میں موجود یادگاروں کی مختصر سی تاریخ عربی میں بیان کی، جس کا خلاصہ یہ ہے:

فراعنہ کا عہد تین ادوار میں منقسم ہے۔ عہد قدیم، عہد متوسط اور عہد جدید۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

عہد قدیم

یہ پہلے آٹھ خاندانوں پر مشتمل تھا۔ یہ عہد ۵۵۰۰ قبل از مسیح سے لے کر ۳۳۰۰ قبل از مسیح تک ہے۔ پہلا فرعون مینا (Menes) تھا جس نے بالائی اور زیریں مصر کو یکجا کیا۔ پہلے تین خاندانوں نے مصری فنون کو نیا رخ دیا۔ خاندان نمبر ۴ سے ۶ تک نے اہرام کی تعمیر کی۔ چوتھے خاندان نے جیزہ کے پہلے بڑے ہرم خوفو (Cheops)، دوسرے ہرم خضرع (Chephren) اور تیسرے میکرینوس (Mikerinos) کی تعمیر کی۔ پہلا فرعون باپ ہے، دوسرا اس کا بھائی اور تیسرا بھائی کا بیٹا۔ فرعون قیصر کی مانند خاندانی نام ہرم منقرع ہے۔ ہیروغلیفی میں اصل لفظ Per-aa ہے، جس کے معنی ہیں ''بڑا گھرانا''۔ اس لفظ کی تعریب کے بعد 'ن' کا اضافہ کیا گیا ہے۔

عجائب گھر کی پہلی منزل میں اسی عہد کے فراعنہ کے دیوہیکل مجسمے ہیں جنھیں دیکھ کر دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ بادشاہوں کے مجسموں کے علاوہ شیخ البلد (Mayor) اور کاہن (Priest) کے مجسمے بھی دیکھے۔ شیخ البلد کا اوپر کا دھڑ تو

ننگا تھا، البتہ نچلے حصے میں گھٹنوں تک نصف دھوتی نما چادر تھی۔ لگتا ہے کہ اس زمانہ میں یہی عام لباس تھا۔ کاہن کا چھوٹا سا مجسمہ مادرزاد برہنہ تھا۔ عضو تناسل کو کاہن نے ہاتھ سے چھپایا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس زمانے کے ہتھیار، سکے اور صنعت گری کے اعلیٰ نمونے رکھے ہوئے تھے۔ ملکاؤں نے سر پر بارو کہ (Wig) پہنا ہوا تھا۔ ایک وسیع و عریض ہال کے دونوں جانب یہ یادگاریں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔

عہد متوسط

یہ عہد ۲۰۶۴ تا ۱۷۰۳ قبل از مسیح نویں خاندان سے لے کر سترہویں خاندان پر مشتمل ہے۔ بارہویں خاندان کے عہد حکومت میں طیبہ (الاقصر) اور کرنک کے قریب بڑے بڑے آثار تعمیر کیے گئے۔ اس دور کے آخری تین خاندانوں کا تعلق بربری قبائل سے تھا۔ جنھوں نے نہر سویز کی طرف سے مصر پر چڑھائی کی۔ ان قبائل کو کتاب مقدس میں (Hyksos) (چرواہے بادشاہ) کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

انھوں نے بھی فراعنہ کا انداز حکومت، مذہب اور لغت اپنائی۔ ہیروغلیفی (Hieroglyphic) تصویری خط کو صوتی نظام عطا کیا۔ السنۂ سامیہ کے ۲۲ حروف تہجی کی ایجاد کا سہرا بھی ان کے سر ہے۔ دریائے نیل کے ڈیلٹا کے مشرق میں زوان (Zoan) نامی شہر آباد کیا، اس کا موجودہ نام تینس (Tanis) ہے۔ انھوں نے ۵۰۰ برس تک حکومت کی۔ جب ان کا غلبہ مستحکم ہو گیا تو انھوں نے ممفس (Memphis) ہی کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام کا تعلق بھی اسی زمانے سے ہے۔ عجائب گھر کی دوسری منزل میں اس عہد کے آثار بھی موجود ہیں۔

عہد جدید

یہ عہد ۱۵۵۰ تا ۱۲۰۰ قبل از مسیح اٹھارہویں خاندان سے لے کر بیسویں یا اکیسویں خاندان پر مشتمل ہے۔ یہ عہد واقعات، حادثات اور آثار سے بھرپور ہے۔ اسی عہد حکومت میں سلطنت کی حدود کو وسعت ملی۔ تحتمس اول (Tuthomosis I) نے اپنی بیٹی حتشبسوت (Hatshepshut) کو شریک اقتدار کیا۔ یہی خاتون اپنے بھائی تحتمس سوم (Tuthomosis III) کے عدم بلوغ کی وجہ سے مصر پر حکمرانی کرتی رہی۔ اسی کی فوج نے جزیرۃ العرب پر چڑھائی کی اور اسی کے زمانے میں حجاز اور یمن کا علاقہ دریافت ہوا۔ اس نے مصر پر ۲۰ برس حکومت کی۔ علامہ عبداللہ یوسف علی نے اپنے انگریزی ترجمہ میں سورۂ اعراف کے آخر میں ضمیمہ ۴ میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ حضرت موسیٰ

علیہ السلام کے زمانے کا فرعون یہی تحتمس اول (Tuthomosis I) تھا اور اس کی یہی بیٹی موسیٰ علیہ السلام کو دریاے نیل سے نکال کر لائی اور اسی نے رضاعت کے لیے ان کو ان کی والدہ کے سپرد کیا، مگر یہ رائے تاریخی اعتبار سے قطعی غلط ہے۔ اس پر بحث بعد میں ہو گی۔

رمسیس ثانی جسے رمسیس اعظم بھی کہا جاتا ہے، انیسویں خاندان کا مشہور ترین حکمران تھا۔ اس نے چھیاسٹھ یا سڑسٹھ برس حکومت کی۔ اس کے سو کے قریب بچے تھے۔ منفتاح اس کا تیرہواں بیٹا تھا۔ اس کے بنائے ہوئے آثار پورے مصر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کی فوج یورپ، ہندوستان (بحر عمان) اور خلیج بنگال تک پہنچی۔

عجائب گھر کی دوسری منزل اسی دور کے آثار کے لیے وقف ہے۔ فراعنہ اور اعیان مملکت کے مجسمے، آلات و ہتھیار، زیورات، برتن، آلات موسیقی اور شکار کے لوازمات بڑے قرینے سے رکھے ہوئے ہیں، مگر سب سے بڑھ کر سونے کا وہ خزانہ ہے، جو ایک ہال کمرے میں محفوظ کیا گیا ہے۔ توت انخ امون (Tutankhamun) کی قبر طیبہ (Luxor) کی وادی الملوک میں ایک سر بمہر دیوار کے پیچھے تھی۔ وادی الملوک کی قبروں میں سے سب سے آخر میں اس قبر کو Howard Carter نے ۱۹۲۲ء میں دریافت کیا۔ یہ واحد قبر تھی جو لٹیروں کی دست برد سے محفوظ رہی اور اپنی اصلی حالت میں جوں کی توں دریافت ہوئی۔ مقبرہ کیا تھا 'Carter' کے الفاظ میں سونے سے بھرا ہوا خزانہ تھا۔ اس میں آلات حرب، کپڑے، فرنیچر، ہیرے جواہرات، سونے کے زیورات، آلات موسیقی، کشتیوں کے ماڈل، تابوت اور مصنوعی چہرہ (Mask) شامل تھے۔ ان میں سے اکثر چیزیں یا تو ٹھوس سونے کی تھیں یا ان پر سونے سے ملمع کاری کی ہوئی تھی۔ ممی ایک دوسرے کے اندر رکھے ہوئے تین خالص سونے کے صندوقوں میں تھی۔ ان کے گرد چار لکڑی کے بنے ہوئے بڑے بڑے تبرک خانے (Shrines) تھے جن میں معبودوں کے مجسمے رکھے ہوئے تھے۔ جن سونے کے صندوقوں میں ممی رکھی ہوئی تھی، ان میں اندر رکھا ہوا صندوق خالص سونے کا ہے جس کا وزن 110.4 کلو گرام ہے۔ خالص سونے کا بنا ہوا نقاب (مصنوعی چہرہ) ہے جس میں رنگ برنگے شیشے اور قیمتی پتھر جڑے ہوئے ہیں۔ اس نقاب کے سر پوش پر عقاب اور کوبرا (پھنیر) حفاظت کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں اس کا وزن 100.2 کلو گرام ہے۔ بھونرے قدیم مصریوں کے یہاں مقدس تھے، اس کی شکل پر تراشا ہوا سونے کا آویزہ ہے جس پر ہیروغلیفی خط میں توت انخ امون کا نام کندہ ہے۔ ابنوس اور ہاتھی دانت کا بنا ہوا ایک بکس ہے، جس پر ایک باغ کی منظر کشی کی گئی ہے، جہاں توت انخ امون اپنی ملکہ سے پھول وصول کر رہا ہے۔ ایک اور لکڑی کا بکس ہے جس پر سونے کی ملمع کاری کی گئی ہے جس پر اس فتح کی منظر کشی ہے جو فرعون نے اہل شام پر حاصل کی۔ اس کے ڈھکنے پر ایک منظر ہے جس میں

فرعون شیر، شتر مرغ اور چکارے کا شکار کر رہا ہے۔ اب توت انخ امون کی ممی برٹش میوزیم میں ہے۔ اس مقبرے کی چیزوں کا معاینہ کرتے کرتے (Howard Carter) کو دس برس سے اوپر کا عرصہ لگا۔ داد دینی پڑتی ہے یورپ کے ان علما کو جنھوں نے ان قیمتی خزانوں کو زمین کی تہ سے نکال کر عجائب گھروں کی زینت بنایا۔ یہاں (Jean Francois Champollion) کا ذکر بے محل نہ ہوگا جسے مصر کے آثار قدیمہ کا باپ سمجھا جاتا ہے، جس نے (Rosetta Stone) نامی سنگ سیاہ کی ایک سل ۱۷۹۹ء میں ڈیلٹا کے مغرب میں (Rosetta) نامی مقام پر دریافت کی۔ اس کے اوپر نیچے اور درمیان میں تین تحریریں ہیں۔ سب سے اوپر ہیروغلیفی، درمیان میں پروہتی (مصری عوامی) اور نیچے یونانی زبان ہے۔ تینوں تحریروں کا مضمون ایک ہی ہے۔ چنانچہ شمپو لیونی نے اس لوح کو پڑھا اور ہیروغلیفی خط کو سمجھا۔ یہ لوح اب برٹش میوزیم میں ہے۔ آنے والے اسکالرز کے لیے یہ لوح کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔

عجائب گھر کی دوسری منزل کے ایک سرے پر ایک تاریک سا کمرہ ہے۔ ایک سو مصری پاؤنڈ کا ٹکٹ لے کر تنگ سی راہ داری سے گزر کر اس کمرہ میں جانا پڑتا ہے۔ وہاں پر گیارہ ممیائی ہوئی فراعنہ کی لاشیں ہیں، جن کی ترتیب درج ذیل ہے۔ تاریخیں وہی ہیں جو ممیوں کے سرہانے الواح پر درج ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

1.King Se-QEHERETA II (1550-1539 B.c)

2.Princess MERIT AMUN (1545-1525 B.c)

3.King AMENHOTEP I (1525-1504 B.c)

4.King TUTHMOSIS I (1550-1492 B.c)

5.King TUTHMOSIS II (1492-1479 B.c)

6.King TUTHMOSIS III (1479-1425 B.c)

7.King AMENHOTEP ii (1428-1397 B.c)

8.King TUTHMOSIS iv (1397-1388 B.c)

9. King SETI I (1290-1279 B.c)

10.King RAMSES II (1279-1213 B.c)

11.King MERENPTAH (1213-1203 B.c)

کیونکہ یہ زمانہ قبل از تاریخ ہے، اس لیے یہ تاریخیں یقینی نہیں۔ مصریات کے علما کے درمیان ان تاریخوں کے بارے میں خاصا اختلاف ہے۔

فرعون موسیٰ کون ہے؟

اس بارے میں اس قدر اختلاف ہے کہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا، بہرحال چار مختلف نقطہ ہاے نظر کا خلاصہ پیش خدمت

ہے:

پہلا نقطۂ نظر بائبل کی روایت (Kings 1:6:1) پر مبنی ہے۔ یہ روایت تورات میں موجود نہیں۔ روایت ہے کہ مصر سے اسرائیلیوں کا خروج (Exodus) ہیکل سلیمانی کی تعمیر سے ۴۸۰ برس پہلے ہوا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہیکل کی تعمیر اپنے عہد حکومت کے چوتھے سال ۹۶۱ یا ۹۷۱ قبل از مسیح میں کی۔ یہ تاریخ ۱۴۴۰ یا ۱۴۵۰ قبل از مسیح کے لگ بھگ بنتی ہے۔ اس زمانہ میں تحتمس سوم (Tuthomosis III) مصر پر حکمران تھا نہ کہ تحتمس اول جیسا کہ علامہ عبداللہ یوسف علی نے سورۂ اعراف کے آخر میں ضمیمہ ۴ میں لکھا ہے۔

اس نقطۂ نظر پر حسب ذیل اعتراض پائے جاتے ہیں:

۱۔ کتاب مقدس کی عبارت کو اگر تاریخی لحاظ سے دیکھا جائے تو غلط معلوم ہوتی ہے۔ اول کتاب پیدایش (Genesis15:13) کے مطابق بنی اسرائیل ۴۰۰ سال اور خروج (Exodus 12:40) کے مطابق ۴۳۰ سال مصر میں رہے۔ اس طرح بائبل کی مذکورہ بالا روایت کے مطابق ان کا خروج ۱۴۵۰ قبل از مسیح اور دخول ۱۸۵۰ قبل از مسیح قرار پاتا ہے۔ جو وہی زمانہ ہے جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام مصر میں موجود تھے۔ بائبل کی ایک روایت کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام کے درمیان ۲۵۰ برس کا وقفہ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں مصر میں بنی اسرائیل کا نام ونشان تک نہ تھا، اس لیے یہ تاریخ مشکوک معلوم ہوتی ہے۔

۲۔ (The Bible, The Quran and Science) کا مصنف (Maurice Bucaill) کتاب کے صفحہ ۲۲۵ پر بعض ہیروغلیفی دستاویزات کا حوالہ دیتا ہے، جس میں (Habiru) یا (Apiru, Hapiru) نامی مزدوروں کا ذکر ہے جو عمارتیں تعمیر کرتے تھے اور کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ یہ غالباً وہی ہیں جن کو بائبل میں عبرانی (Hebrews) کہا گیا ہے۔ فرعون (Amenophis II) پندرھویں صدی قبل از مسیح میں اس قسم کے ۳۶۰۰ مزدوروں کو جبری مشقت کے لیے کنعان سے قیدی بنا کر لایا تھا۔ تحتمس سوم (Tuthomosis III) کے عہد میں ان کو اصطبل کے مزدوروں کے نام سے پکارا گیا ہے۔ فرعون سیتی اول (Seti I) کے عہد حکومت میں ان مزدوروں نے کنعان کے علاقہ میں بغاوت کی۔ بائبل سے پتا چلتا ہے کہ رمسیس ثانی کے زمانہ میں انھوں نے رمسیس اور پیتھوم (Pithom) نامی شہر تعمیر کیے۔ آج کل قنطر (Qanter) اور تینس (Tanis) کے شہر نیل کے ڈیلٹا کے مشرقی حصہ میں واقع ہیں۔ یہ شہر (Ghoshen) سے دور نہ تھے، جہاں اسرائیلی رہایش پذیر تھے اور جس سے انھوں نے خروج کیا۔ (Tuthomosis III) کا دار الحکومت طیبہ میں تھا جو دور جنوب میں ہے۔ اس نے ڈیلٹا کے علاقہ میں کوئی

تعمیرات نہیں کیں۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ حضرت موسیٰ کے زمانہ کا فرعون وہی ہے جس نے تیرہویں صدی قبل از مسیح میں رمسیس اور پیتھوم نامی شہر تعمیر کرائے، خروج انھی شہروں کے قریب سے ہوا تھا۔ ۱۴۴۰ قبل از مسیح تک تو بنی اسرائیل سرزمین مصر میں داخل بھی نہیں ہوئے تھے۔

۳۔ انسائیکلوپیڈیا بریطانیکا مطبوعہ ۱۹۷۷ء (۱۲/ ۴۸۷) میں لکھا ہے کہ سیدنا موسیٰ کی پیدایش چودہویں صدی قبل از مسیح کے آخر میں ہوئی۔ یعنی (Tuthomosis) (۱۴۲۵-۱۴۷۹) کے عہد میں تو موسیٰ علیہ السلام کا وجود بھی نہ تھا۔ یہ ناممکن ہے کہ خروج رمسیس ثانی کی تخت نشینی سے پہلے ہوا ہو۔

۴۔ انسائیکلوپیڈیا بریطانیکا مطبوعہ ۱۹۷۷ء میں کتاب مقدس کی مذکورہ بالا روایت کی بڑی اچھی توجیہ کی گئی ہے۔ لکھا ہے: موسیٰ علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کے درمیان بارہ نسلوں کا فاصلہ ہے۔ مذکورہ روایت میں تمثیلی انداز میں ایک نسل کا حساب ۴۰ برس لگایا گیا تو خروج ۱۴۴۰ قبل از مسیح بنا، مگر یہ حساب مبالغہ آمیز ہے، اگر ایک نسل کا حساب ۲۵ برس کیا جائے تو خروج ۱۲۵۰ قبل از مسیح بنتا ہے۔

دوسرا نقطۂ نظر زیادہ متداول ہے اور اب تک اسی کو یقینی رائے سمجھا جاتا رہا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا بریطانیکا مطبوعہ ۱۹۵۳ء میں لکھا ہے: ''بنو اسرائیل پر جور وستم ڈھانے والا فرعون رمسیس (بائیبل کا رعمسیس) ہے اور خروج کے وقت ڈوب مرنے والا فرعون اس کا بیٹا مرنفتاح (Merneptah) ہے جس کا ایک تلفظ منفتاح (Meneptah) بھی ہے۔'' ''بائیبل، قرآن اور سائنس'' کے فرانسیسی مصنف نے اس نقطۂ نظر کو بڑی شد و مد کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کتاب (مطبوعہ ۱۹۷۵ء) میں لکھا ہے:

> ''یہ حقیقت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی پیدایش رمسیس ثانی کے زمانہ میں ہوئی۔ بائیبل کی روایت خروج (۲:۲۳) میں ہے: ''جب موسیٰ مدائن میں تھے تو وہ فرعون (۶۷ برس) حکومت کرنے کے بعد مر گیا''... جب انھوں نے فرعون سے بنو اسرائیل کی نجات کے بارے میں گفتگو کی تو ان کی عمر بائیبل کی روایت (خروج ۷:۷) کے مطابق اسی برس تھی۔ رمسیس ثانی اور منفتاح کے زمانے کے علاوہ کوئی ایسا زمانہ نہیں جس کے درمیان ۸۰ برس یا اس سے زیادہ کا عرصہ ہو۔ منفتاح کے زمانہ میں موسیٰ علیہ السلام بنو اسرائیل کے نمائندے کے طور پر پیش ہوئے۔ یہ قصہ منفتاح کے عہد حکومت کے آخری نصف میں ہوا۔ (Drioton) اور (Vandier) نے منفتاح کے عہد حکومت کے بارے میں دو احتمالات کا ذکر کیا ہے۔ ۱۲۳۴ تا ۱۲۲۴ قبل از مسیح یعنی دس برس یا ۱۲۲۴ تا ۱۲۰۴ یعنی بیس برس۔ اس کا خاتمہ کب ہوا، مصریات اس بارے میں خاموش ہیں۔ حضرت موسیٰ نے اس کے عہد حکومت کے آخر میں بنو اسرائیل

کے ساتھ خروج کیا۔ اس کے علاوہ اور کوئی امکان نہیں، کیونکہ بائیبل اور قرآن، دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ تعاقب کرنے والا فرعون ڈوب مرا۔'' (۳۳۸)

ڈاکٹر شوقی ابوالخلیل نے اپنی کتاب ''اطلس القرآن''، حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے ''قصص القرآن'' اور مولانا مودودی نے ''تفہیم القرآن'' میں سورۂ یونس کی آیت ۹۲ کی تفسیر کے تحت اسی رائے کی تائید کی ہے۔ مولانا مودودی نے منفتاح کو غلط طور پر منفتہ لکھا ہے اور یہ جو لکھا ہے کہ اس کی لاش پر سالٹ (نمک) تھا، اس کا تذکرہ ''بائیبل، قرآن اور سائنس'' کے مصنف نے نہیں کیا، حالانکہ اس نے خود منفتاح کی ممی کا معائنہ کیا ہے اور اس کی تفصیل لکھی ہے۔

اس نقطۂ نظر پر سب سے بہتر تبصرہ یہودی انسائیکلو پیڈیا (Jewish Encyclopedia) میں ہے:

''انجام کار اس سے بہتر اور یقینی رائے کوئی نہ تھی کہ رمسیس ثانی وہ فرعون تھا جس نے بنو اسرائیل پر ستم ڈھائے اور منفتاح وہ فرعون تھا جو خروج کے وقت ڈوب مرا۔ یہ خروج یا تو تیرھویں صدی قبل از مسیح کے وسط میں ہوا یا آخر میں۔ مگر اسرائیلی کتبہ (Sixtemple Plate 13-147) کی دریافت نے اس نتیجہ کو مشکوک بنا دیا ہے، اس کتبہ کی سطر نمبر ۲۷ میں دشمنوں پر فتح یاب ہونے کا قصہ درج ہے۔ اس کے آخر میں لکھا ہے: ''اسرائیل کو (اس قدر) تباہ کر دیا گیا ہے کہ ان کے پھلنے پھولنے کا کوئی امکان نہیں''، فلسطین مصر کے لیے بیوہ کی مانند ہو گیا ہے۔'' (۵۰۰/۸)

یہ الفاظ مرنفتاح (Mereneptah) کے عہد حکومت کے پانچویں سال لکھے گئے۔ یہ قدرتی طور پر اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اسرائیلی اس وقت فلسطین میں پوری طرح آباد ہو چکے تھے۔ اس لیے خروج کا منفتاح کے عہد حکومت میں واقع ہونے کا کوئی امکان نہیں رہتا۔

یہ حجری ستون (Stele) وہ واحد ہیروغلیفی دستاویز ہے جس پر سب سے پہلے لفظ اسرائیل لکھا ہوا ملا۔ یہ طیبہ (Thebes) میں فرعون کے جنازی معبد (Funeral Temple) سے دریافت ہوا۔ اس میں ان فتوحات کا ذکر ہے جو مرنفتاح (منفتاح) کو مصر کے پڑوسی ممالک پر حاصل ہوئیں۔ اس ستون کے آخر میں اسرائیلیوں پر فتح کا ذکر ہے۔ چنانچہ علما اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ لفظ اسرائیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرنفتاح (منفتاح) کے عہد حکومت کے پانچویں سال تک اسرائیلی کنعان میں پوری طرح آباد ہو چکے تھے، اس لیے خروج کے وقت مرنفتاح (منفتاح) کے تعاقب کرنے اور ڈوب مرنے کا کوئی امکان نہیں۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

محمد وسیم اختر مفتی

عمر فاروق رضی اللہ عنہ

[''سیر و سوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

(۲)

سیرت و عہد

مغرور شاہ روم ہرقل اپنے دار الحکومت سے دور جنگ سے نچنت ہو کر اطمینان کا ایک سال گزار چکا تھا۔ عراق و شام اور دجلہ و فرات کے بیچ واقع الجزیرہ (Mesopotamia) اس وقت تک فتح نہ ہوا تھا۔ یہاں کے عیسائیوں نے اس سے خط کتابت کی کہ اگر وہ سمندر کی جانب سے مسلمانوں پر حملہ آور ہو تو وہ زمینی راستوں سے اس کی مدد کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اب تک ہونے والی زمینی لڑائیوں میں روم کا بحری بیڑا مکمل طور پر محفوظ رہا تھا، ہرقل کو معلوم تھا کہ مسلمان سمندر سے گھبراتے ہیں، وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ شام کی سرحدیں ابھی بھی عیسائیوں کے لیے محفوظ ہیں۔ دوسری طرف شمالی شام میں عرب عیسائی اسلامی چھاؤنیوں میں بدامنی پھیلا کر مسلمانوں کو پریشان کر سکتے ہیں۔ ان امکانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس نے ۱۷ھ میں اپنے جنگی بیڑے کو فوج اور اسلحے سے لیس کر کے اسکندریہ سے انطاکیہ کو روانہ کر دیا۔ دوسری جانب الجزیرہ کے قبائل کا لشکر حمص کو چل پڑا۔ امیر افواج اسلامی ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے یہ اطلاعات سنیں تو خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو مشاورت کے لیے قنسرین سے طلب کر لیا۔ دونوں نے

شام کے شمالی شہر حمص (امیسا) میں فوجیں مجتمع کر کے دشمن کا مقابلہ کرنے پر اتفاق کیا۔ ہرقل کے بحری جہاز انطاکیہ پہنچے تو وہاں کے شہریوں نے اپنے دروازے کھول کر آنے والی فوج کا استقبال کیا۔ اب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ حمص میں محصور ہو گئے تھے، انھیں صحرا اور سمندر، دونوں جانب سے آنے والے لشکروں نے گھیر لیا تھا۔ انھوں نے امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مشورہ طلب کیا، وہاں پر موجود تمام کمانڈر قلعہ بند ہو کر دار الخلافہ سے کمک کی آمد کا انتظار کرنے کے حق میں تھے۔ اکیلے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ دشمن کا مقابلہ کرنے کا مشورہ دے رہے تھے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ قعقاع بن عمر کی سرکردگی میں ایک لشکر فوراً ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی مدد کے لیے بھیج دیا جائے، چنانچہ وہ ۴ ہزار تجربہ کار فوجیوں کو لے کر کوفہ سے حمص روانہ ہو گئے۔ خلیفۂ ثانی نے سہیل بن عدی کو الجزیرہ، عبداللہ بن غسان کو نصیبین اور ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو ربیعہ و تنوخ کے قبائل کی سرکوبی کے لیے بھیجنے کا حکم بھی دیا۔ انھوں نے عیاض بن غنم کو اس پوری مہم کا انچارج مقرر کیا اور خود مدینہ سے حمص روانہ ہو گئے۔ الجزیرہ (Mesopotamia) کے باشندگان کو ہیت، قرقیسا اور موصل کا انجام یاد تھا، وہ گھبرا کر واپس پلٹ گئے۔ ۳۰ ہزار کا یہ لشکر چھٹا تو صرف ہرقل کی سربراہی میں آنے والی رومی فوج کا سامنا کرنا باقی رہ گیا۔ ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے فیصلہ کیا کہ میدان جنگ میں رومیوں کو پوزیشنیں سنبھالنے کا موقع ہی نہ دیا جائے اور ان پر اچانک حملہ کر دیا جائے۔ مسلمان حمص کے قلعوں سے نکل کر ان پر یک لخت ٹوٹ پڑے تو وہ گھبرا گئے، ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور مغلوب ہو گئے۔ قعقاع رضی اللہ عنہ کی کمک تین دن کے بعد پہنچی، جبکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جابیہ یا تبوک کے قریبی مقام سرغ تک آپائے تھے۔ وہ مدینہ لوٹ گئے، انھوں نے کوفہ سے آنے والی فوج کو مال غنیمت میں سے حصہ دینے کی ہدایت کی۔

ادھر سہیل بن عدی نے رقہ اور رہا کے رہنے والوں کو، عبداللہ بن عتبہ نے اہل نصیبین کو اور ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ نے بنو تغلب کو معاہدات صلح کرنے پر مجبور کر دیا۔ عیاض، سہیل اور عبداللہ کی ایک مشترکہ کارروائی میں حران والوں نے بھی جزیہ دینا قبول کر لیا۔ بنوایاد الجزیرہ سے بھاگ کر ہرقل کے کنٹرول والے علاقے میں چلے گئے تھے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے ہرقل کو خط لکھا کہ انھیں فوراً لوٹایا جائے، چنانچہ ان میں سے ۴ ہزار واپس آئے اور اسلامی اقتدار کے تحت رہنا قبول کیا۔ بنو تغلب کے لوگ مسلمان نہ ہونا چاہتے تھے، وہ ادائے جزیہ سے انکار بھی کر رہے تھے۔ ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کا معاملہ طے نہ ہوا تو ان کا ایک وفد مدینہ آیا۔ انھوں نے عمر رضی اللہ عنہ سے مطالبہ کیا کہ جزیہ یا خراج کا نام لے کر انھیں بدکایا نہ جائے، صدقہ کے نام سے چاہے دگنی وصولی کر لی جائے۔ علی رضی اللہ عنہ نے

www.javedahmadghamidi.com

رائے دی کہ ان سے حاصل ہونے والے ٹیکس کو صدقہ کا نام دینے میں کوئی حرج نہیں ۔ یہ نزاع ختم ہوا تو عمر رضی اللہ عنہ نے ولید رضی اللہ عنہ کو معزول کر کے فرات بن حیان کو ان کا امیر مقرر کر دیا۔ بعد کے معرکوں میں ان تغلبی عیسائیوں نے اسلامی حکومت کا بہت ساتھ دیا۔

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ قنسرین لوٹے تو ان کے پاس بے شمار مال غنیمت اور جنگی قیدی تھے۔ لوگ ان کے پاس عطیات کے لیے آنے لگے، کندہ کے امیر اشعث بن قیس بھی ان میں شامل تھے۔ خالد رضی اللہ عنہ نے ان کو ۱۰ ہزار درہم دیے، انھوں نے کسی شاعر کو انعام سے بھی نوازا۔ یہ خبریں امیر المومنین تک پہنچیں، اس سے پہلے انھیں معلوم ہوا تھا کہ خالد رضی اللہ عنہ ارمینیہ کے مقام آمد پر ایک حمام میں گئے اور شراب ملی ہوئی بوٹی جسم پر مل کر نہائے۔ جب عمر رضی اللہ عنہ نے باز پرس کی تو خالد رضی اللہ عنہ کا جواب تھا: یہ ایک صابن ہے جس کی تیاری میں شراب اپنی صفات کھو دیتی ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ مطمئن نہ ہوئے تھے۔ اس بار انھوں نے افواج اسلامی کے امیر ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو حکم بھیجا کہ خالد رضی اللہ عنہ کو بلا کر ان کا عمامہ اتار لیا جائے، اس کی ٹوپی نکال کر کپڑے سے ان کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے جائیں اور ۱۰ ہزار درہموں کا حساب لیا جائے۔ پھر قنسرین کی کمان ان سے واپس لے لی جائے، کیونکہ اگر انھوں نے یہ رقم اپنے مال سے عطیہ کی ہے تو اسراف ہوا اور اگر غزوۂ روم سے حاصل ہونے والے اموال سے دی ہے تو خیانت ٹھہری۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ یہ حکم سن کر مبہوت ہو گئے، تاہم انھوں نے خالد رضی اللہ عنہ کو مسجد میں طلب کر کے منبر کے سامنے کھڑا کیا، بلال رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کے ایلچی نے انھیں باندھا، پھر اس ایلچی نے ۱۰ ہزار کی بابت سوال کیا۔ بار بار کے استفسار پر خالد رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ وہ میرا مال تھا۔ وہ اپنی ہتک پر رنجیدہ تھے۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ منبر سے اترے، خالد رضی اللہ عنہ سے معذرت کی اور کہا: یہ سب امتثال امر خلیفہ میں تھا۔ انھوں نے معزولی کا حکم کچھ عرصہ چھپائے رکھا۔ اسی دوران میں عمر رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ خالد رضی اللہ عنہ کو ان کے عہدے پر بحال کر دیا جائے۔ انھوں نے یہ درخواست نہ مانی، اس کے بجائے عزل کا حکم براہ راست خالد رضی اللہ عنہ کو بھیج دیا۔ خالد رضی اللہ عنہ نے اہل قنسرین کو الوداعی خطاب کیا اور حمص چلے گئے، وہاں سے مدینہ کی راہ لی۔ جب وہ عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پہنچے تو بتایا کہ یہ انعام میں نے اس مال میں سے دیا جو جنگوں میں میرے حصے میں آیا یا غنیمت کے طور پر مجھے ملا، آپ حساب کر لیں اور ۶۰ ہزار درہم سے زائد رقم بیت المال میں جمع کر لیں۔ عمر رضی اللہ عنہ نے جب ان کے اثاثوں کی چھان بین کی تو ۸۰ ہزار درہم (یا ۷ ہزار دینار) بنے، فالتو ۲۰ ہزار درہم بیت المال میں جمع کر لیے گئے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے خالد رضی اللہ عنہ کے بری الذمہ ہونے کے خطوط تمام اسلامی سلطنت

میں بھیج دیے۔ خالد رضی اللہ عنہ کے لیے فوج سے دور حالت امن میں زندگی گزارنا بہت مشکل تھا، اسے وہ عورتوں والی زندگی سمجھتے تھے۔ ۴ برس اسی طرح گزر گئے، ان کا آخری وقت آیا تو انھیں میدان جنگ کے بجائے بستر پر مرنے کا بہت قلق تھا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے ترکے میں ایک گھوڑا، ایک غلام اور کچھ اسلحہ دیکھ کر کہا: ابوسلیمان (خالد بن ولید رضی اللہ عنہ) کے بارے میں ہمارا گمان غلط تھا۔

۱۷ ہجری میں نئی اسلامی سلطنت کو دو بڑی قدرتی آفات کا سامنا کرنا پڑا۔ ۹ ماہ جاری رہنے والا قحط عام، جس نے شمالی و جنوبی تمام عرب کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اس عرصے میں بارش کا ایک قطرہ نہ ٹپکا، جبکہ پہلے سے موجود تمام کھیتی سوکھ سڑ کر راکھ ہو گئی، اکثر بھیڑ بکریاں ہلاک ہوئیں اور دودھ دینے والے جانوروں کا دودھ خشک ہو گیا۔ ہوا چلتی تو ہر طرف راکھ اڑنے لگتی، اس سال کا نام ''عام الرمادۃ'' (راکھ والا سال) اسی لیے پڑا۔ جو جانور بچ گئے، ان کا گوشت سوکھ کر کھانے کے قابل نہ رہا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ لوگوں نے چوہوں کے بل کھود کر ان کی جمع شدہ خوراک حاصل کی۔ قحط شروع ہوا تو شہر مدینہ کے حالات اچھے تھے، لوگوں نے اپنی زرخیز زمینوں سے حاصل ہونے والا غلہ ذخیرہ کر رکھا تھا۔ صحراؤں کے رہنے والے، البتہ ابتدا ہی سے مصیبتوں کا شکار ہو گئے۔ وہ شکایتیں لے کر امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آنے لگے۔ ان کی مدد کرتے کرتے آخر کار مدینہ کے ذخائر بھی ختم ہو گئے۔ اس زمانۂ قحط میں بھی امیر المومنین کا طرز عمل مثالی اور قابل تقلید تھا۔ ان کے اس عمل اور ان کے اخلاص کی وجہ سے لوگ ان کے ساتھ رہے۔ جیسے انھوں نے مسلمانوں کا خیال رکھا، ویسے ہی مسلمانوں نے اپنے امیر کا پاس کیا۔ ایک بار انھیں گھی سے چپڑی ہوئی روٹی دی گئی، انھوں نے ایک بدو کو ساتھ شریک کیا۔ بدو لقمے کے ساتھ چکنائی بھی کھینچ کر اپنی طرف کر لیتا۔ عمر رضی اللہ عنہ کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ جب سے قحط ہوا ہے، میں نے گھی اور زیتون خود کھایا ہے نہ کسی کو کھاتے دیکھا ہے۔ انھوں نے قسم کھائی کہ جب تک قحط لوگوں سے ختم نہیں ہوتا، گوشت کھاؤں گا نہ گھی چکھوں گا۔ ان کا غلام بازار سے ۴۰ درہم کا گھی اور دودھ لے آیا تو انھوں نے فوری طور پر صدقہ کرنے کا حکم دیا۔ پھر کہا: مجھے رعایا کا خیال کیسے ہو سکتا ہے جب تک ان کو آنے والی تکلیف مجھے بھی لاحق نہ ہو۔ ان کا رنگ سرخی مائل سفید تھا، لیکن عام الرمادہ میں یہ سیاہ پڑ گیا۔ لوگ کہنے لگے: اگر قحط ختم نہ ہوا تو عمر رضی اللہ عنہ ہی چل بسیں گے۔

امیر المومنین نے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو فلسطین سے، معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما اور ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو شام سے اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو عراق سے مدینہ غلہ بھیجنے کی ہدایت کی۔ سب سے پہلے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے غلہ سے لدے ہوئے ۴ ہزار اونٹ بھیجے، جو عمر رضی اللہ عنہ نے خود مدینہ کے مضافات میں تقسیم کیے۔

انھوں نے ان کے بدلے میں ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو ۴ ہزار درہم بھی ادا کیے۔ پھر عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے ۲۰ بحری جہاز اور ایک ہزار اونٹ بھیجے جن پر آٹا اور گھی لدا ہوا تھا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے ۳ ہزار اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ایک ہزار اونٹ آٹا بھیجا۔ کپڑوں کے ۵ ہزار جوڑے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اور ۳ ہزار عبائیں ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے بھیجیں۔ سارے غلے کی تقسیم سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی نگرانی میں کرائی۔ وہ دارالخلافہ میں ثرید بنواتے، اونٹوں کا گوشت پکواتے اور خود لوگوں کے ساتھ مل کر کھاتے۔ ایک بار ان کے ساتھ دستر خوان پر کھانے والوں کا شمار کیا گیا تو ۷ ہزار آدمی ہوئے، اسی روز جن عورتوں، بچوں اور بیماروں کو گھروں میں کھانا مہیا کیا گیا، ان کی تعداد ۴۰ ہزار تھی۔ رفتہ رفتہ یہ تعداد بڑھ کر علی الترتیب ۱۰ ہزار اور ۵۰ ہزار ہو گئی۔ آٹا اور گھی لوگوں کے گھروں میں بھی فراہم کیا جاتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ان اقدامات کے باوجود زمانۂ قحط میں کئی امراض پھیل گئے۔ کئی چل بسے اور بہت بیمار پڑ گئے۔ مریضوں کا علاج معالجہ اور مردوں کی تجہیز و تکفین عمر رضی اللہ عنہ خود کراتے۔ مادی وسائل کو بروے کار لانے کے ساتھ وہ شب بھر دعا و آہ و زاری میں مشغول رہتے، اللہ کے حضور گڑگڑاتے کہ امت میرے ہاتھوں ہلاک نہ ہو جائے۔ پھر انھوں نے نماز استسقا پڑھائی، رو رو کر بارش کی دعا مانگی۔ عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ ان کے داہنے ہاتھ کھڑے تھے، عمر رضی اللہ عنہ نے ان کا واسطہ بھی دیا۔ اللہ نے ان کی دعا قبول کی، خوب مینہ برسا اور کھیتیاں ہری بھری ہو گئیں۔ اب عمر رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں جم جانے والے بدووں کو شہر چھوڑنے کی ہدایت کی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ شہری زندگی کے خوگر ہو گئے تو اپنے دیہاتوں میں واپس جا نہ پائیں گے۔ تمام عرصۂ قحط میں خلیفۂ ثانی کی ہدایت رہی کہ کسی علاقے پر حملہ نہ کیا جائے، البتہ اپنے دفاع کی پوری تیاری رکھی جائے۔ اس سال انھوں نے زکوٰۃ بھی اکٹھی نہ کی۔ قحط ختم ہوا تو انھوں نے اپنے عاملین کو ۲ برس کی زکوٰۃ لینے کا حکم دیا۔ ایک عام الرمادہ کی اور دوسری اگلے برس کی۔ انھوں نے ہدایت کی کہ ایک حصہ فوری طور پر ضرورت مندوں میں بانٹ دیا جائے اور دوسرا بیت المال میں جمع کرایا جائے۔

عہد فاروقی میں آنے والی دوسری بڑی آفت بیت المقدس اور رملہ کے بیچ واقع عمواس نامی بستی میں پھوٹنے والی طاعون کی وبا تھی، جسے اسی نسبت سے ''طاعون عمواس'' کہا جاتا ہے۔ ۱۷ ہجری کے اواخر یا ۱۸ ہجری کی ابتدا میں یہ وبائی مرض عمواس سے شروع ہو کر شام و عراق کے پورے درمیانی علاقے میں پھیل گیا اور ایک ماہ جاری رہا۔ ایک دفعہ اس وبا کی شدت کم ہو گئی، لیکن اس نے پھر عود کیا۔ مجموعی طور پر اس نے ۲۵ ہزار مسلمان مردوں، عورتوں، شہریوں اور فوجیوں کی جانیں لیں۔ معرکۂ الجزیرہ کے سلسلے میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے سرغ یا جابیہ تک پہنچ کر مدینہ واپس لوٹنے کی وجہ یہی وبا تھی۔ انھوں نے طاعون کی خبر سن کر مہاجرین و انصار سے مشاورت کی تو کچھ نے کہا کہ آپ جس کام سے آئے ہیں،

اسے پورا کیے بغیر نہ لوٹیں۔ دوسروں نے مشورہ دیا کہ کبار اصحاب رسول کو وبا کے خطرے میں ڈالنا مناسب نہیں۔ جب انھوں نے واپسی کا فیصلہ کر لیا تو ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کیا اللہ کی تقدیر سے بھاگ رہے ہیں؟ عمر رضی اللہ عنہ کا جواب تھا: ہاں، ہم اللہ کی ایک تقدیر سے اس کی دوسری تقدیر کی طرف فرار ہو رہے ہیں۔

گر ز یک تقدیر خوں گردد جگر

خواہ از حق حکم تقدیر دگر

عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے یہ فرمان نبوی سنا کر عمر رضی اللہ عنہ کے موقف کی تائید کی: 'اذا سمعتم بارض قوم فلا تقدموا علیه،فاذا وقع بارض انتم فیها فلا تخرجوا منها فراراً منه '' ''جب تم کسی قوم کی سرزمین میں طاعون پھیلنے کی خبر سنو تو وہاں نہ جاؤ اور جب یہ اس جگہ پھوٹے جہاں تم موجود ہو تو اس سے فرار کی خاطر وہاں سے نہ نکلو۔'' (بخاری، رقم ۵۷۳۰) خلیفۂ ثانی ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے بہت محبت کرتے تھے حتیٰ کہ اپنے بعد انھی کو خلیفہ مقرر کرنا چاہتے تھے، اس لیے انھیں ملاقات کے بہانے مدینہ بلایا۔ وہ بھی سمجھ گئے کہ عمر رضی اللہ عنہ مجھے شام سے نکالنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے لکھ بھیجا: مجھے آپ کے ضروری کام کا پتا چل گیا ہے، میں اپنی فوج چھوڑ کر نہیں آ سکتا تا آنکہ اللہ ہماری تقدیر کا فیصلہ کر دے۔ اب عمر رضی اللہ عنہ نے فوج کو ترائی سے نکال کر بلند مقام پر لانے کی نصیحت کی، لیکن تب تک وہ طاعون میں مبتلا ہو چکے تھے، انھوں نے ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے کہا کہ فوج کو لے کر جابیہ کی طرف کوچ کریں۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ ان کے پیچھے آئے، کچھ افاقہ ہوا تو انھوں نے فوج سے خطاب کرتے ہوئے کہا: یہ بیماری تم پر اللہ کی رحمت نازل کرنے کا باعث بنے گی۔ ان کے انتقال کے بعد معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو ان کا جانشین بنایا گیا، معاذ رضی اللہ عنہ اور ان کا بیٹا عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بھی طاعون سے فوت ہو گئے تو عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کمانڈر بنے۔ وہ عمر رضی اللہ عنہ کی ہدایت پر فوج کو پہاڑوں پر لے گئے تو طاعون کا زور ٹوٹ گیا۔ اس مرض کا شکار ہونے والوں میں یزید بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما، سہیل بن عمرو، حارث بن ہشام اور عتبہ بن سہیل بھی شامل تھے۔ حارث بن ہشام کے ساتھ شام جانے والے ان کے ۷۰ اہل خانہ میں صرف ۴ بچ پائے۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ۴۰ بیٹوں نے اس وبا میں جان دی۔ رومی لشکر اس وبا کے دوران میں مسلمانوں پر حملہ کرتا تو اس کا مقابلہ مشکل ہوتا، لیکن ہرقل خود طاعون سے خوف زدہ تھا، اس نے حملے کی جرأت نہ کی۔ پھر جب یہ وبا شام سے عراق منتقل ہوئی اور وہاں بھی بہت تباہی مچائی تو یزدگرد نے بھی عراق واپس لینے کی کوئی جستجو نہ کی۔

وبا ختم ہونے کے بعد عمر رضی اللہ عنہ علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں اپنا قائم مقام مقرر کر کے شام پہنچے اور وہ تمام شامی

www.javedahmadghamidi.com

علاقہ دیکھا جہاں طاعون نے قیمتی جانیں لے لی تھیں۔ انھوں نے حمص، دمشق اور شام کی سرحدوں کے انتظامی معاملات نمٹائے۔ پھر وبا میں وفات پانے والوں کے مسائل میراث سلجھائے، کیونکہ ان کی وجہ سے کئی پیچیدگیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ پہلے وہ معاویہ رضی اللہ عنہ کو دمشق کا اور شرحبیل بن حسنہ کو اردن کا گورنر مقرر کر چکے تھے، اب شرحبیل کو ہٹا کر تمام صوبہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے ماتحت کر دیا، اس لیے کہ ان کے خیال میں وہ زیادہ سیاسی بصیرت رکھتے تھے۔ ان کے اس اقدام نے تاریخ اسلامی پر گہرا اثر ڈالا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طویل گورنری میں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں بھی جاری رہی، بنوامیہ کا رسوخ بڑھ گیا۔ بالآخر مکمل اقتدار انھی کے پاس آ گیا اور اسلامی دارالخلافہ مدینہ سے دمشق منتقل ہو گیا۔ دورہ مکمل ہونے کے بعد خلیفۂ ثانی جابیہ پہنچے، بلال رضی اللہ عنہ ان کے ساتھ تھے۔ نماز کا وقت ہوا تو لوگوں نے اصرار کیا کہ بلال رضی اللہ عنہ اذان دیں۔ کئی سالوں کے بعد بلال رضی اللہ عنہ کی آواز بلند ہوئی تو عمر رضی اللہ عنہ ہچکیاں لے کر رونے لگے، خود بلال رضی اللہ عنہ کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ بیت المقدس کے قریب شام کی سرزمین میں یہ بلال رضی اللہ عنہ کی پہلی اور آخری اذان تھی۔ یہ جزیرۂ عرب سے باہر عمر رضی اللہ عنہ کا آخری دورہ تھا۔ مدینہ میں کچھ دیر قیام کرنے کے بعد وہ حج کے لیے روانہ ہوئے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

طاعون عمواس پھوٹنے کا صحیح سبب معلوم نہیں، متاخرین اہل تاریخ کا خیال ہے کہ عراق و شام کی جنگوں میں بے شمار لوگ مارے گئے، جن کی میتوں کو صحیح طرح دفنایا نہ جا سکا۔ ان انسانی اجسام کے گلنے سڑنے سے جراثیم کی بھرمار ہوئی تو طاعون کا جرثومہ (pasturella pestis) لوگوں پر حاوی ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ مورخین متقدمین کہتے ہیں کہ شام میں مقیم کچھ مسلمان شراب پینے لگے تھے۔ قائد جیش اسلامی ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ ان کو منع کرتے تو وہ اس کی حلت کی تاویلیں کرتے۔ انھوں نے امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو مطلع کیا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں موجود اصحاب رائے کو اکٹھا کر کے فیصلہ لیا۔ قرآن کے الفاظ 'فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ'، ''تو کیا تم شراب نوشی سے باز آؤ گے؟'' (سورۂ مائدہ ۵:۹۱) کے پیش نظر سب نے شراب کے حرام ہونے پر اجماع کیا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے حکم بھیج دیا کہ جو شراب کو حلال سمجھتا ہے، اسے قتل کر دیا جائے اور جو حرام سمجھ کر پیتا ہے، اسے ۸۰ درے مارے جائیں اور فاسق ٹھہرایا جائے۔ یہ حد خلیفۂ اول ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نافذ نہ کی تھی، لیکن اس فاروقی اجماع کے بعد اسے بھی حدود اللہ میں شمار کیا جانے لگا۔ ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے اس فیصلے پر عمل کرنے کے ساتھ یہ بددعا بھی کی: اے اہل شام، تمھاری تنبیہ کے لیے کوئی بڑا حادثہ ہونا چاہیے، تب طاعون پھوٹا۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بہت رقیق القلب تھے، باور نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے ایسی بددعا کی ہو پھر چند مسلمانوں کی شراب نوشی کی سزا پورے اسلامی معاشرے کو دینا بھی قرین انصاف نہیں تھا۔

مطالعۂ مزید: تاریخ الامم والملوک (طبری)، البدایہ والنہایہ (ابن کثیر)، الفاروق عمر (محمد حسین ہیکل)، تاریخ اسلام (اکبر شاہ خاں نجیب آبادی)۔

[باقی]

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

جاوید احمد غامدی

قافلہ در قافلہ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

میں نے جس دور میں شعور کی آنکھ کھولی، وہ اسلامی انقلاب کے لیے قائم ہونے والے اداروں اور تنظیموں کا دور تھا۔ انسان اپنے گردوپیش سے متاثر ہوتا ہے۔ چنانچہ کالج کے زمانے میں ہم چند دوستوں نے بھی ''دائرۃ الفکر'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان میں یار عزیز ڈاکٹر ساجد علی سب سے نمایاں تھے۔ وہ اس وقت پنجاب یونیورسٹی میں شعبۂ فلسفہ کے سربراہ ہیں۔ لنک میکلوڈ روڈ پر میرے پاس کرایے کا ایک کمرا تھا۔ ماہنامہ ''خیال'' کے نام سے میں وہاں سے ایک رسالہ شائع کرنا چاہتا تھا۔ اس ادارے کی ابتدا اسی کمرے سے ہوئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی انقلاب کے لیے ایک تحریک برپا کی جائے جس میں یہ ادارہ ایک علمی مرکز اور مرکز قیادت کی حیثیت سے کام کرے۔ اس کے بعد ایک دارالعلوم قائم کرنے کا ارادہ تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ اس دارالعلوم سے جو لوگ پڑھ کر نکلیں، آیندہ کے لیے تحریک کی قیادت انھی میں سے منتخب کی جائے۔ یہ ایک رومانوی تصور تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی جماعت میں جو خامی رہ گئی ہے، وہ اسی طرح دور کی جاسکتی ہے۔ دو تین ماہ تک ہم لنک میکلوڈ روڈ کے اس کمرے میں ملتے اور پڑھتے پڑھاتے رہے، لیکن اندازہ ہوا کہ پیش نظر مقصد کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت اکٹھے گزارنا ضروری ہے۔ چنانچہ ان دوستوں نے جو ہاسٹل میں رہتے تھے، فیصلہ کیا کہ وہ ہاسٹل چھوڑ دیں گے اور اپنا سب جیب خرچ اور ہاسٹل کے اخراجات کے لیے ملنے والی رقم ملا کر ایک مکان کرایے پر لیں گے، جہاں اس تحریک کا مرکز قائم کیا جائے گا۔ میرا گھر اس زمانے میں لاہور ریلوے اسٹیشن کے پاس محلہ سلطان پورہ میں تھا۔ تلاش شروع ہوئی تو ایک مکان قریب ہی مل گیا اور یہ سب دوست وہاں منتقل ہو گئے۔

ہم جو دارالعلوم قائم کرنا چاہتے تھے، اس کا نام ہم نے ''جامعہ الحمرا'' تجویز کیا تھا۔ اس کی رعایت سے ''الحمرا'' کے نام سے ایک مجلّہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ دوستوں کے مشورے سے طے ہوا کہ اس کے لیے کتابت کے بجائے ٹائپ پر چھاپنے کا طریقہ اختیار کیا جائے، جس میں حروف جوڑ کر عبارت تیار کی جاتی ہے۔ جن لوگوں کو اس طریقۂ طباعت کا تجربہ ہے، وہ جانتے ہیں کہ اس میں پروف کی غلطیاں بہت ہوتی تھیں جنھیں دقت نظر سے درست کرنا پڑتا تھا۔ ہمارے ساتھ حادثہ یہ ہوا کہ پروف دیکھ کر ہم پریس والوں کے حوالے کر آئے اور مطمئن ہو گئے کہ غلطیوں کی تصحیح ہو جائے گی۔ مگر مجلّہ چھپ کر آیا تو معلوم ہوا کہ جن غلطیوں کی نشان دہی کی گئی تھی، ان میں سے کوئی غلطی بھی درست نہیں ہوئی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اسے ضائع کر دیا جائے۔ یہ پہلا حادثہ تھا جس سے اپنی ناتجربہ کاری کے باعث دوچار ہونا پڑا۔ ابھی اس کی پریشانی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک اور افتاد آ پڑی۔ چند ہی مہینوں کے بعد ہمیں وہ مکان خالی کرنا پڑا جس میں اپنی تحریک کا ایک مرکز ہم نے قائم کر لیا تھا۔ نیا مکان کئی مہینوں کی تگ و دو سے ملا۔ یہ ماڈل ٹاؤن کے جے بلاک میں ۲۹ نمبر مکان تھا۔ ہم نے خدا کا شکر کیا کہ تعطل کا زمانہ زیادہ طویل نہیں ہوا اور کام ایک مرتبہ پھر شروع ہو گیا ہے۔

۱۹۷۱ء کے جون میں ہماری ملاقات لاہور کے ایک ایڈووکیٹ چودھری محمد انور صاحب سے ہوئی۔ ان کے ایک بزرگ دوست سید بدر بخاری بھی اس ملاقات کے موقع پر موجود تھے۔ یہ دونوں ہمارے پروگرام سے بہت متاثر ہوئے۔ ان کی تجویز تھی کہ اس کام کو آگے بڑھانے کے لیے علامہ اقبال روڈ پر ان کے محلے میں درس قرآن کا ایک حلقہ قائم کیا جائے۔ ۷/ جولائی کو یہ حلقہ قائم ہوا اور اس کے نتیجے میں ہم طالب علموں کو چند بڑوں کی سرپرستی بھی حاصل ہو گئی۔ ان میں سید ارشد بخاری اور شیخ محمد ارشد سب سے نمایاں تھے۔ یہ دونوں دوست تھے اور واپڈا میں ملازمت کرتے تھے۔ اس سے پہلے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے درسوں میں بڑی باقاعدگی سے شریک ہوتے رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ان دونوں کو ارشدین کہا کرتے تھے۔ ڈیڑھ دو برس تک درس و تدریس کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ اب کافی لوگ ہمارے ساتھ کام کرنے کے لیے تیار تھے۔ لہٰذا سید بدر بخاری کی امارت میں تحریک کا باقاعدہ نظم قائم کر دیا گیا۔ اہل حدیث کے ایک ممتاز عالم مولانا عبدالرحمٰن صاحب مدنی ہمارے قریب ہی رہتے تھے۔ وہ بھی اس میں شامل ہو گئے۔ درس کے بعض دوسرے شرکا نے بھی اس میں شمولیت اختیار کر لی۔ تاہم یہ سلسلہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہا۔ بدر بخاری صاحب عمر کے اس حصے میں تھے کہ اس طرح کے کسی نظم کی قیادت ان کے لیے آسان نہ تھی۔ لہٰذا چند مہینوں کے اندر ہی باہمی مشورے سے یہ تنظیم ختم کر دی گئی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

مارچ ۱۹۷۳ میں ہم نے دائرۃ الفکر سے ایک مجلّہ ''اشراق'' کے نام سے چھاپا۔ ہمارا خیال تھا کہ ڈیکلریشن مل جائے گا تو اسے ایک باقاعدہ رسالے کی صورت دے دیں گے اور اس کے ذریعے سے اپنی بات لوگوں تک پہنچائیں گے، لیکن بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ ڈیکلریشن ملنا آسان نہیں ہے۔ اس لیے یہ اسکیم روبہ عمل نہ ہو سکی۔ اس کے چند ماہ بعد ہمارے مالک مکان نے کرایہ بڑھانے کا مطالبہ کر دیا۔ اس وقت کے حالات میں ہمارے لیے ممکن نہ تھا کہ اس کا مطالبہ پورا کرتے، اس لیے ماڈل ٹاؤن کا یہ مکان بھی چھوڑنا پڑا۔ اس کے بعد کئی مہینے تک ہم لوگ منتشر رہے۔ ادارہ بھی معطل رہا۔ خدا خدا کر کے گارڈن ٹاؤن کے احمد بلاک میں ایک مکان ملا۔ دوست جمع ہوئے، ساز و سامان درست کیا گیا اور پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔

ہمارے بعض دوستوں کو ''دائرۃ الفکر'' کا نام پسند نہیں تھا۔ چنانچہ اس کی جگہ ادارے کے لیے ''دارالاشراق'' کا نام اختیار کیا گیا۔ ابتدا میں جو طالب علم اس سے متعلق ہوئے تھے، ان میں سے میں اور ساجد علی ہی باقی تھے۔ شیخ افضال احمد، مستنصر میر، چودھری الیاس احمد اور چودھری محمد رفیق نئے رفقا تھے۔ ہمارے دوست ذوالفقار احمد خاں بھی اسی دور کی یادگار ہیں۔ وہ ہمارے قریب ہی رہتے تھے، اور اگرچہ ادارے سے متعلق نہیں تھے، مگر اسی کے ایک فرد سمجھے جاتے تھے۔ یہی معاملہ اصغر نیازی اور محمد طارق میکن کا بھی تھا۔ یہ دونوں دوستانہ تعلق سے ہمارے پاس مقیم تھے۔

اس زمانے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی خدمت میں بھی اکثر حاضر ہونے کا موقع ملتا تھا۔ ایک روز ملاقات کے لیے گیا تو اس کام کا بھی ذکر ہوا۔ مولانا نے تفصیلات پوچھیں، رفقا سے تعارف حاصل کیا، میں نے اپنی مشکلات بتائیں، وہ موانع بیان کیے جو کام میں تعطل کا باعث بن جاتے تھے اور ان سے سرپرستی کی درخواست کی۔ مولانا نے میری یہ درخواست ازراہ عنایت قبول فرمالی۔ چنانچہ ان کی ہدایت کے مطابق ادارے کے لیے میرے اور مولانا کے نام سے ایک مشترک اکاؤنٹ اچھرہ کے حبیب بنک میں کھولا گیا جس میں مولانا نے اپنی جیب سے ماہانہ ایک ہزار روپے جمع کرانے شروع کر دیے۔ احمد بلاک سے ہم لوگ مولانا کے گھر کے پاس انھی کی دی ہوئی ایک عمارت ۱۔اے ذیلدار پارک اچھرہ میں منتقل ہو گئے۔ مولانا کا خیال تھا کہ اسے ''ادارۂ معارف اسلامی'' کی ایک شاخ یا ایک نئے ادارے کی حیثیت سے منظّم کیا جائے گا۔ اس سے پہلے مولانا ہی کے ایما سے میں ''جماعت اسلامی'' کا رکن بن چکا تھا، لیکن مولانا کا یہ فیصلہ جماعت کے بعض بزرگوں کو پسند نہیں آیا۔ چنانچہ ایک مہم شروع ہوئی اور سات آٹھ مہینے کے بعد ہی میں نے محسوس کر لیا کہ ان حالات میں یہاں رہ کر کام کرنا ممکن نہ ہو گا۔ جماعت کی یہ خواہش بھی اسلم سلیمی صاحب نے مجھ تک پہنچا دی تھی کہ ادارہ جس عمارت میں قائم ہے، اسے وہ الیکشن کا دفتر بنانا

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

چاہتی ہے۔ یہ صورت حال بتا رہی تھی کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ لہٰذا ہم نے مشورہ کیا، مولانا سے اجازت چاہی اور چودھری الیاس احمد کی دعوت پر لاہور کے قریب ہی واقع ان کے گاؤں مرید کے منتقل ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ ۱۹۷۶ء کے آخر میں ہم یہاں پہنچے اور ۱۱؍جنوری ۱۹۷۷ کو جماعت اسلامی پنجاب کے امیر مولانا فتح محمد صاحب کا ایک خط موصول ہوا جس میں انھوں نے مطلع کیا تھا کہ جماعت سے میری رکنیت ختم کر دی گئی ہے۔ یہ ایک دو سطروں کی تحریر تھی جس میں بغیر کوئی وجہ بتائے فیصلہ سنا دیا گیا تھا کہ میں اب جماعت کا رکن نہیں رہا۔ میاں طفیل محمد صاحب اس زمانے میں جماعت اسلامی پاکستان کے امیر تھے۔ میں نے ان کے نام خط لکھا اور اس فیصلے کے وجوہ معلوم کرنا چاہے، مگر اس کا کوئی جواب مجھے کبھی نہیں دیا گیا۔

یہ وصل وفصل میرے لیے زندگی کا ایک اہم تجربہ تھا۔ میں نے اس عرصے میں اپنے عہد کی ایک عظمت کو بہت قریب سے دیکھا، ان کے ساتھ کھڑے ہو کر نمازیں پڑھیں، ان سے باتیں کیں، زندگی کے آداب سیکھے، صبر و حکمت کا درس لیا، زبان و بیان کی بعض نزاکتیں سمجھیں، ماچھی گوٹ سے پہلے اور بعد میں جو کچھ ہوا، اس کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر خود ان کی زبان سے سنا، مولانا اصلاحی کے ساتھ ان کے علمی اختلافات پر ان سے تبادلۂ خیالات کیا۔ امام فراہی کے متعلق ان کے عقیدت مندانہ تاثرات سنے، ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر اور علامہ اقبال سے ان کی محبت کی داستان سنی۔ یہ صحبتیں سرمایۂ حیات ہیں اور میں اب بھی مولانا کو اسی طرح یاد کرتا ہوں، جس طرح ایک مہجور بیٹا اپنے باپ کو یاد کرتا ہے۔ ان کی جماعت کو بھی میں اپنی برادری سمجھتا ہوں اور پالیسی اور طرز عمل سے ہزار اختلافات کے باوجود ایسا ہی تعلق خاطر محسوس کرتا ہوں، جس طرح کوئی شخص اپنے خاندان سے محسوس کرتا ہے۔ میرے خلاف مہم میں جو لوگ پیش پیش رہے، وہ شاید مجھے نہیں جانتے تھے، اس لیے ان سے بھی کوئی گلہ نہیں ہے۔ میں ان سے حسن ظن رکھتا ہوں کہ انھوں نے جو کچھ کیا، اپنی دانست میں جماعت کی بہتری کے لیے کیا۔ مولانا نے امریکا جانے سے پہلے آخری ملاقات میں مجھ سے کہا تھا: میری عزیز توقعات آپ سے وابستہ ہیں۔ اپنے ناقدین کی بات ہمیشہ توجہ کے ساتھ سنیے، پستی پر اتر آئیں تو 'مروا باللغو مروا کراما' کا طریقہ اختیار کیجیے، وہ آپ کو مشتعل کرنا چاہیں تو ان کے افترا اور بہتان طرازی کے باوجود اشتعال میں آنے سے انکار کر دیجیے، اس کے بعد خدا آپ کے ساتھ ہو گا اور آپ ان شاء اللہ انھیں اپنے میدان میں شکست دیں گے۔ زندگی کے نشیب و فراز میں مولانا کی یہ نصیحت ہمیشہ میرے پیش نظر رہی ہے۔ یہ اسی کا اثر ہے کہ:

اس دشت بے چراغ میں کرتا ہوں روز و شب
پیدا ہر اک ببول سے سرو و سمن کو میں

لاہور سے مرید کے آجانے کا ذکر تھا کہ مولانا کی صحبتیں یاد آگئیں اور لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم۔ ہمارے ایک نئے رفیق ملک محمد اشرف شادی شدہ تھے۔ یہاں آنے کے بعد میری اور میر صاحب کی بھی شادی ہوگئی۔ اب ہاسٹل کے طریقے پر رہنا ممکن نہ تھا۔ حالات میں جو تبدیلی آئی تھی، اس کی بنا پر ضروری تھا کہ رفقا کی کفالت کے لیے کوئی معقول بندوبست کیا جائے۔ ہم نے بہت کوشش کی، مگر اس کے لیے جتنے وسائل چاہییں تھے، وہ کسی طرح میسر نہیں ہوئے۔ لہٰذا کم وبیش دو سال تک مرید کے میں بقا کی جدوجہد کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اس ادارے کی بساط لپیٹ دی جائے۔ یہ ۱۹۷۸ء کے اپریل کی کوئی شام تھی، جب ہم نے کئی دن کی بحث وتمحیص کے بعد بالآخر فیصلہ کرلیا اور برسوں کے ساتھی بادل نخواستہ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہونے لگے۔ اس عرصے میں ''اشراق'' کا ڈیکلریشن مل گیا تھا۔ یہ مستنصر میر کے نام تھا۔ اس کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۷۹ میں شائع ہوا۔ رسالے کا اداریہ اسی موضوع پر تھا اور میں نے اس میں لکھا تھا:

''...نومبر ۱۹۷۰ میں وہ اکیڈیمی وجود میں آئی جو ''دارالاشراق'' کے نام سے لاہور سے ۲۶ کلومیٹر دور مرید کے کی بستی میں اپریل ۱۹۷۸ تک باقاعدگی سے کام کرتی رہی اور اب کئی ماہ سے معطل ہے۔ میرے کچھ رفقا برسوں کی جدوجہد کے بعد گھروں کو لوٹ چکے ہیں، کچھ لوٹ جائیں گے۔ یہ ایک کام تھا جو شروع ہوا اور اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے سعی وجہد کے بے شمار مراحل سے گزرا اور ختم ہوگیا۔ میرے احباب کا تقاضا ہے کہ میں اس کام کی نوعیت اور اس کے تعطل کے وجوہ واسباب پر قلم اٹھاؤں تاکہ وہ لوگ جو اس کے احیا سے دل چسپی رکھتے ہیں، اگر کچھ کرنے کی ہمت رکھتے ہوں تو کرسکیں۔ میں نہیں جانتا کہ اس کا دوبارہ آغاز کب ہوسکے گا، لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرے عزم میں کوئی کمی نہیں آئی۔ مجھے یقین ہے کہ کرنے کا اصل کام یہی ہے۔ میرا احساس ہے کہ میں یہ کام کرسکتا ہوں۔ میرے پروردگار نے چاہا تو یہ قافلہ پھر گرم سفر ہوگا۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ منتشر ہوگیا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ دم لینے کے لیے کسی منزل پر ٹھیر گیا ہے۔ شاید زاد راہ لینے کے لیے، شاید نئے سفر کا آغاز کرنے کے لیے۔ میں آواز جرس سن رہا ہوں اور میں نے قلم اٹھالیا ہے۔''

اس سے آگے میں نے لکھا تھا:

''...یہ بات شروع ہی سے میرے سامنے تھی کہ یہ کوئی جز وقتی کام نہیں ہے۔ اس کے لیے آنے والوں کو شب و روز کے لیے آنا ہوگا اور ساری زندگی کے لیے آنا ہوگا۔ مجھے معلوم تھا کہ جو لوگ اس میں اپنا سب کچھ کھپا دینے کے لیے آئیں گے، ان کی کفالت کی ذمہ داری بالآخر اس ادارے کو اٹھانا ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا ہی سے میں نے یہ کام دو جہتوں سے شروع کیا۔ مردان کار کی تلاش اور وسائل کی فراہمی کی جدوجہد میں نے ایک ہی وقت میں شروع

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

کی۔اب میں محسوس کرتا ہوں کہ پہلے کام کے لیے میرا مزاج موزوں تر اور دوسرے کے لیے سخت ناموزوں واقع ہوا ہے، اوراس کا نتیجہ یہ ہے کہ مجھے ارباب عزم کو جمع کر لینے میں جہاں غیر معمولی کامیابی ہوئی، وسائل کو تلاش کرنے میں ویسی ہی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔اس داستان کو بالتفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ یہ فرہاد و بیستوں کی حکایت ہے، خار مغیلاں کو خون دل سے سیراب کرنے کی کہانی ہے۔ میں اس کو یہاں بہت اختصار کے ساتھ رقم کر رہا ہوں۔ خاطر احباب کی گراں باری کا احساس ہے، لیکن اسے چند حرفوں میں بیان کرنے کا موقع شاید یہی ہے:

پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے

یہ کام کب شروع ہوا، عرض کر چکا ہوں۔ ابتدا مشکل تھی، ہوگئی تو احباب وقتاً فوقتاً اس کام سے متعلق ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۵ء میں ان کی تعداد سات تک پہنچ گئی۔ان میں افضال احمد صاحب اور محمد اشرف صاحب نے معاشیات، ساجد علی صاحب نے فلسفہ، الیاس احمد صاحب نے سیاسیات، محمد رفیق صاحب نے عربی اور مستنصر میر صاحب نے انگریزی میں ایم۔اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ منصور الحمید صاحب ایم بی بی ایس تھے۔ مستنصر میر صاحب نے سی ایس ایس کیا تھا اور سول سروس اکیڈیمی میں ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد تقرر سے کچھ روز پہلے ملازمت کا خیال چھوڑ کر حلقۂ درویشاں میں شامل ہو گئے تھے۔ان میں سے ہر فرد کا ایثار بے مثال ہے۔ یہ بڑی صلاحیتوں کے حامل نوجوان تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی عزیمت، ان کا ذوق علم، ان کا حسن طبیعت، ان کا سوز نہاں اس اکیڈیمی کی تاریخ کی متاع بے بہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خود میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ میرا احساس ہے کہ یہ آنے والے دور کو بہت کچھ دے سکتے تھے۔لیکن اپنے زمانۂ قیام میں یہ شاید ہی چند ماہ کے لیے اطمینان کے ساتھ کام کر سکے ہوں۔ مالی وسائل کی کمی نے اس کام کو بار بار معطل کیا ہے۔اس کی پوری تاریخ مسلسل بحران کی تاریخ ہے۔ یہاں تدریس بار بار شروع ہو کر ختم ہوئی ہے۔اس کے باوجود اللہ کا احسان ہے کہ کچھ کام ہو گیا اور بہت تھوڑا باقی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ ڈیڑھ دو سال مزید کام کرنے کا موقع مل جاتا تو اس کاوش کا مرحلۂ اول مکمل ہو جاتا۔ اب یہ سب کچھ معطل ہے اور مریدکے کی اس ارض عقیم میں ہم خداے لم یزل کے چند ناتواں بندے ایک نئے عزم کے ساتھ اس کے احیا کے لیے کوشاں ہیں۔ معلوم نہیں، عرصۂ تعطل کب ختم ہوگا۔لیکن مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کام کو ضائع نہیں کریں گے۔''

میری جدوجہد کا پہلا مرحلہ یہاں ختم ہو گیا۔ لاہور واپس آنے کے بعد خیال تھا کہ اب صرف رسالہ نکالوں گا۔ ''اشراق'' کا ڈیکلریشن مستنصر میر کے نام پر مل گیا تھا، لیکن ابھی دو شمارے ہی نکلے تھے کہ میر صاحب کے امریکا جانے کا پروگرام بن گیا۔ پھر میرے اور ان کے درمیان رسالے کی پالیسی کے بارے میں بھی کچھ اختلاف تھا۔ لہٰذا

یہ خواہش پوری نہیں ہوئی اور ''اشراق'' ایک مرتبہ پھر بند کرنا پڑا۔

ان دنوں چند طلبہ میرے پاس عربی ادب کی بعض کتابیں پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ مولانا ابوشعیب صفدر علی اور مسعود اکبر پاشا ان میں سب سے نمایاں تھے۔ ابوشعیب سرگودھا کے ایک عالم اور مولانا حسین علی واں بھچراں کے شاگرد رشید مولانا غلام نقشبند کے فرزند ارجمند تھے۔ ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کے پیش نظر میری خواہش تھی کہ وہ لاہور منتقل ہو جائیں۔ مریدکے کے دور ابتلا میں جن لوگوں نے ہمارے ساتھ غیر معمولی تعاون کیا، ان میں ہماری برادری کے ایک بزرگ ڈاکٹر فرخ حسین ملک بھی تھے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو توجہ دلائی تو انھوں نے ''فرخ فاؤنڈیشن'' کے نام سے ایک ادارہ بنا دیا جس کے مہتمم مستنصر میر کے والد گرامی صفدر میر بنائے گئے۔ انھوں نے میرے ہی ایما سے ایک مجلّہ ''الاعلام'' کے نام سے شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس میں اگرچہ میرا نام بھی لکھا گیا، لیکن تمام عملی ضرورتوں کے لیے ابوشعیب اس کے مدیر مقرر کیے گئے۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ اس کے نتیجے میں ان کے لیے لاہور میں قیام کے اسباب میسر ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ رسالہ بھی زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہ سکا۔ ڈیڑھ دو سال بعد ہی مولانا ابوشعیب کو پنجاب یونیورسٹی میں ملازمت مل گئی اور رسالہ بند ہو گیا۔

یہی دن تھے، جب میں نے استاذ امام سے عرض کیا کہ اب حلقۂ تدبر قرآن کو بھی ایک باقاعدہ ادارے میں تبدیل کر دینا چاہیے۔ یہ حلقہ ان کی جماعت اسلامی سے علیحدگی کے بعد قائم ہوا تھا۔ مولانا نے یہ تجویز پسند فرمائی۔ ان کے ایما سے میں نے اس کا دستور لکھا اور ''ادارۂ تدبر قرآن و حدیث'' کے نام سے یہ ادارہ قائم ہو گیا۔ سہ ماہی ''تدبر'' اسی ادارے کے تحت شائع ہوتا ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ پیش نظر مقاصد کے لیے اب اسی میں کام کیا جائے، مگر بہت جلد واضح ہو گیا کہ حلقہ کے بزرگ اسے پسند نہیں کریں گے۔ اس کے بعد یہی مناسب تھا کہ کوئی کشمکش پیدا کرنے کے بجائے ادارے سے الگ ہو کر اپنے طریقے پر کام کرتا رہوں۔

اس زمانے میں طلبہ کی ایک جماعت مجھ سے پڑھ رہی تھی۔ ان میں ایک نعیم رفیع بھی تھے۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے آتے تو بار بار اصرار کرتے کہ اس کام کا احیا ہونا چاہیے جو ۱۹۷۸ء میں ختم ہو گیا تھا۔ پچھلے تجربات کی وجہ سے میں اس کے لیے راضی نہ تھا۔ پھر خالد ظہیر اور آفتاب شمسی جیسے احباب بھی ان کے ہم نوا ہو گئے تو بالآخر میں آمادہ ہوا۔ سعید نواز صاحب ہمارے دوستوں میں سب سے بزرگ تھے۔ ان کی سربراہی میں ایک مجلس منتظمہ بنائی گئی۔ اس کی افتتاحی تقریب استاذ امام امین احسن اصلاحی کے زیر صدارت لاہور کے جناح ہال میں منعقد ہوئی جس میں ارباب علم و دانش کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی اور جون ۱۹۸۳ میں وہ ادارہ وجود میں آ گیا جو اب ''المورد'' کے نام سے

۵۱ کے ماڈل ٹاؤن میں قائم ہے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ۱۹۸۵ء میں ''اشراق'' کا احیا بھی ہو گیا۔ ڈیڑھ دو سال یہ ایک مجلّے کی صورت میں شائع ہوتا رہا۔ ۱۹۸۷ء میں مجھے اس کا ڈیکلریشن مل گیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس وقت سے اب تک یہ رسالہ بغیر کسی انقطاع کے نکل رہا ہے۔ ''رینی ساں'' ۱۹۹۰ء میں نکلنا شروع ہوا۔ وہ بھی اسی طرح جاری ہے۔ یہ رسالہ ابتدا ہی سے عزیزم شہزاد سلیم کے سپرد ہے۔ ''اشراق'' میرے پاس رہا، مگر اس کو بھی اب میں نے اپنے بیٹے معاذ احسن کے حوالے کر دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اللہ کی مدد شامل حال رہی تو یہ اسی طرح جاری رہیں گے۔

پچھلے پچیس برسوں میں ''الانصار المسلمون'' اور ''دانش سرا'' کا نظم بھی میرے تعلق سے قائم ہوا اور مولانا وصی مظہر صاحب ندوی اور ڈاکٹر محمد فاروق خان جیسے زعما ان تنظیموں کے سربراہ رہے، مگر ان کی عمر چند برسوں سے زیادہ نہیں ہوئی۔ ''المورد''، البتہ گزشتہ ربع صدی سے قائم ہے اور اللہ کی عنایت سے توقع ہے کہ قائم رہے گا۔ ۸۷ء کے بعد ابتلا اور تعطل کا ایک زمانہ اس پر بھی گزرا ہے، مگر ۱۹۹۱ء میں ہمارے دوست الطاف محمود کی مساعی سے اس کے احیا کے بعد، اللہ کا شکر ہے کہ اس کے کاموں میں کبھی کوئی تعطل پیدا نہیں ہوا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

یہ ادارہ اس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل مسلمانوں کے اندر صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصّبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن و سنت کی بنیاد پر دین کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ و تلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ مذہبی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن چکے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن و سنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول و فروع کی تحصیل اور دوسروں کے مقابلے میں ان کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

یہ ادارہ اس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کا بنیادی مقصد اسلامی علوم سے متعلق علمی اور تحقیقی کام، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اس کی نشر و اشاعت اور اس کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اس کے اہم نکات یہ ہیں:

علم و تحقیق

۱۔ دین کے جید علما اور محققین کو ادارے کی فیلوشپ دی جائے۔

۲۔ علمی کام کی صلاحیت رکھنے والے افراد کو ادارے کی طرف سے یا خود ان کی تجویز پر علمی، تحقیقی، تعلیمی اور دعوتی

منصوبے تفویض کیے جائیں اور اسی بنا پر انھیں ادارے سے متعلق کیا جائے۔

۳۔ ادارے میں کام کرنے والے علما اور محققین کو پیش نظر کاموں کے لیے ضروری ماحول، لائبریری اور دوسری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

تعلیم و تربیت

۱۔ دینی موضوعات پر سیمینار، ورک شاپ اور مختصر مدت کے کورسوں کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ انٹرنیٹ کے ذریعے سے فاصلاتی کورس (dl courses) کرائے جائیں۔

۳۔ پیش نظر مقاصد کے لیے تربیت گاہیں اور دینی اور دنیوی علوم کی درس گاہیں قائم کی جائیں۔

نشر و اشاعت

۱۔ اردو، عربی اور انگریزی زبان میں رسائل جاری کیے جائیں۔

۲۔ انٹرنیٹ پر ان زبانوں میں ویب سائٹس قائم کی جائیں۔

۳۔ ادارے سے متعلق اہل علم کی تحقیقات، خطبات اور تقاریر وغیرہ کی طباعت اور آڈیو/ ویڈیو سی ڈی تیار کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

۴۔ ادارے سے متعلق علما و محققین کے کام کو وسیع پیمانے پر متعارف کرایا جائے۔

۵۔ ادارہ اور اس کے مقاصد کا تعارف لوگوں میں عام کیا جائے۔

''علم و تحقیق'' اور ''نشر و اشاعت'' کے زیر عنوان جو کام بیان ہوئے ہیں، وہ بڑی حد تک ہو رہے ہیں۔ ''تعلیم و تربیت'' کے ذیل میں دینی اور دنیوی علوم کی درس گاہیں آیندہ کے منصوبوں میں سر فہرست ہیں۔ میری تمام سعی و جہد کا محوراب یہی ادارہ ہے۔ زندگی کے جتنے دن باقی ہیں، اپنے علمی کاموں کے علاوہ اسی کے لیے خاص کر چکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے علم و عمل میں اخلاص کی دعا ہے:

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا

[۲۰۰۷ء]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

متفرق سوالات

[المورد میں خطوط اور ای میل کے ذریعے سے دینی موضوعات پر سوالات موصول ہوتے ہیں۔ جناب جاوید احمد غامدی کے تلامذہ ان سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ یہاں ان میں سے منتخب سوال وجواب کو افادۂ عام کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

معراج نبوی

سوال: کیا معراج کی رات نبی صلی اللہ علیہ وسلم آسمانوں پر تشریف لے گئے تھے؟ اور کیا معراج کا واقعہ قرآن سے ثابت ہے؟ (آصف بن خلیل/قمر اقبال)

جواب: معراج کے واقعے کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے۔ ارشاد باری ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ. (بنی اسرائیل ۱۷:۱)

''پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو لے گئی ایک شب مسجد حرام سے اس دور والی مسجد تک، جس کے اردگرد کو ہم نے برکت بخشی ہے تاکہ ہم اس کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں، بے شک سمیع وبصیر وہی ہے۔''

اس آیت میں واقعۂ معراج کا ذکر ہے۔ اس آیت میں بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آسمانوں پر جانے کا ذکر موجود نہیں ہے۔ لیکن حدیث میں اس کی جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں، ان میں یہ ذکر موجود ہے کہ آپ آسمانوں پر گئے تھے۔ ہمارے خیال میں حدیث کا بیان 'لنریہ من اٰیٰتنا' (تاکہ ہم اس کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں) کے الفاظ

کی تشریح وتفسیر ہے۔ بعض علما اسے ایک جسمانی واقعہ قرار دیتے ہیں، ہمارے خیال میں یہ آپ کا رؤیا تھا، جیسا کہ قرآن کی اسی سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۶۰ میں اسے رؤیا قرار دیا گیا ہے۔ البتہ نبی کا رؤیا چونکہ ایک حقیقی واقعہ ہوتا ہے، وہ محض ایک خواب نہیں ہوتا۔ لہٰذا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وہ سارے واقعات حقیقتاً پیش آئے ہیں جو قرآن مجید یا احادیث صحیحہ میں بیان ہوئے۔ (محمد رفیع مفتی)

قبلۂ اول

سوال: کیا بیت المقدس ہمارا پہلا قبلہ ہے یا خانہ کعبہ ہی شروع سے مسلمانوں کا قبلہ رہا ہے؟

(آصف بن خلیل/قمر اقبال)

جواب: قرآن مجید کی درج ذیل آیات میں تحویل قبلہ کا یہ حکم بیان ہوا ہے۔ ارشاد باری ہے:

سَیَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا عَلَیْهَا قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ. وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْكُمْ شَهِیْدًا وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیْهِ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِیْرَةً اِلَّا عَلَی الَّذِیْنَ هَدَی اللّٰهُ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیُضِیْعَ اِیْمَانَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ. قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّیَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَیْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ وَاِنَّ الَّذِیْنَ

”(ابراہیم کی بنائی ہوئی مسجد کو، اے پیغمبر، ہم نے تمھارے لیے قبلہ ٹھیرانے کا فیصلہ کیا ہے تو) اب اِن لوگوں میں سے جو احمق ہیں، وہ کہیں گے: اِنھیں کس چیز نے اُس قبلے سے پھیر دیا جس پر یہ پہلے تھے؟ اِن سے کہہ دو: مشرق اور مغرب سب اللہ ہی کے ہیں، وہ جس کو چاہتا ہے، (اِن تعصّبات سے نکال کر) سیدھی راہ دکھا دیتا ہے۔ (ہم نے یہی کیا ہے) اور (جس طرح مسجد حرام کو تمھارا قبلہ ٹھیرایا ہے) اِسی طرح تمھیں بھی ایک درمیان کی جماعت بنا دیا ہے تاکہ تم دنیا کے سب لوگوں پر (دین کی) شہادت دینے والے بنو اور اللہ کا رسول تم پر یہ شہادت دے۔ اور اِس سے پہلے جس قبلے پر تم تھے، اُسے تو ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لیے ٹھیرایا تھا کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹا پھر جاتا ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ یہ ایک بھاری بات تھی، مگر اُن کے لیے نہیں،

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ.

(البقرہ ۲: ۱۴۲-۱۴۴)

جنھیں اللہ ہدایت سے بہرہ یاب کرے۔ اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ (اِس طرح کی آزمایش سے وہ) تمھارے ایمان کو ضائع کرنا چاہے۔ اللہ تو لوگوں کے لیے بڑا مہربان ہے، سراسر رحمت۔ تمھارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ہم دیکھتے رہے ہیں۔ (اے پیغمبر)، سو ہم نے فیصلہ کر لیا کہ تمھیں اُس قبلے کی طرف پھیر دیں جو تم کو پسند ہے۔ لہٰذا اب اپنا رخ مسجد حرام کی طرف پھیر دو اور جہاں کہیں بھی ہو، (نماز میں) اپنا رخ اُسی کی طرف کرو۔ یہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی تھی، جانتے ہیں کہ اُن کے پروردگار کی طرف سے یہی حق ہے اور (اِس کے باوجود) جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اللہ اُس سے بے خبر نہیں ہے۔''

ان آیات کی مختصر وضاحت یہ ہے کہ مکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے، البتہ آپ اس بات کا اہتمام ضرور کرتے تھے کہ آپ اس رخ پر کھڑے ہوں جس پر خانہ کعبہ اور بیت المقدس، دونوں ہی قبلے آپ کے سامنے آ جائیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک اہل کتاب سے مختلف کوئی طریقہ اختیار نہ کیا کرتے تھے، جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو اس کا حکم یا اس کی اجازت نہ مل جاتی تھی۔

پھر جب آپ مدینہ میں آئے تو وہاں دونوں قبلوں کو بیک وقت سامنے رکھنا ممکن نہ تھا، لہٰذا آپ نے اپنے اصول کے مطابق بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا شروع کر دی، لیکن آپ کا جی یہ چاہتا تھا کہ آپ خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں۔ پھر جیسا کہ درج بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے، کچھ ہی عرصہ بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ حکم دے دیا کہ آپ کعبہ ہی کو اپنا قبلہ بنائیں۔

چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مدینے میں مسلمانوں نے پہلے بیت المقدس کو اپنا قبلہ بنایا تھا۔ (محمد رفیع مفتی)

بچوں کی تربیت

سوال: بچوں کی تربیت کے حوالے سے میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ پہلے بچوں کو انسانیت کے اہم اور بنیادی

ضوابط سکھائے جائیں۔ جیسے سچ بولنا اور احترام وغیرہ تمام اخلاقیات۔ پھر جب وہ بڑے ہو رہے ہوں تو انھیں یہ بتایا جائے کہ دنیا میں بہت سے مذاہب ہیں، تم ان میں سے کوئی بھی مذہب چن سکتے ہو۔ مگر میں تمھاری ماں ایک مسلمان ہوں۔ میں نے تحقیق سے ان اسباب کے تحت اس دین کو چنا ہے۔

موجودہ حالات میں ہم مسلمان پیدا کر رہے ہیں۔ لیکن بچپن ہی میں ان کی برین واشنگ کر دیتے ہیں۔ وہ اسی کو سچ مانتے ہیں جس کے بارے میں ہم انھیں بتا دیتے ہیں کہ یہ سچ ہے۔ میں وہ مسلمان بنانا چاہتی ہوں جو اسلام کی صحیح روح سے آگاہ ہوں۔ پیدایشی طور پر نہیں، بلکہ غور و فکر کے نتیجے میں۔ وہ اللہ تعالیٰ کو اور اسلام کی سچائی کو اپنی تحقیق سے دریافت کریں۔ وہ وہ روایتی مسلمان نہ ہوں جن کی برین واشنگ ہو چکی ہوتی ہے؟ (رفعت سبحان)

جواب: آپ کا جذبہ بہت اعلیٰ ہے۔ اس ہدف کے درست ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان کا ایمان اس کی اپنی دریافت ہو۔ یہ بات بھی صحیح ہے کہ کسی مسلمان کو اندھا مقلد اور اپنے افکار پر جامد نہیں ہونا چاہیے۔ یہ سوچ اتنی اچھی ہے کہ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ لیکن میرے خیال میں بچوں کے حوالے سے آپ کی بات میں کچھ تبدیلیاں ضروری ہیں۔ بچے ہمارے بتانے سے کم اور ہمارے عمل سے زیادہ سیکھتے ہیں۔ لہٰذا بنیادی اصول تو یہ ہے کہ جو آپ اپنے بچوں کو بنانا چاہتی ہیں، وہ خود بنیں۔ اگر بچے آپ کو دیکھیں گے کہ آپ باتیں تو آزادی فکر کی کرتی ہیں، لیکن خود اس پر عامل نہیں ہیں تو آپ کی باتیں تاثیر سے محروم رہیں گی۔

دوسرا انتہائی اہم پہلو یہ ہے کہ تمام بچے یکساں فکری صلاحیت نہیں رکھتے۔ لہٰذا بچوں کی تربیت اور اٹھان میں ان کی صلاحیت اور طبعی رجحانات ملحوظ رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ ممکن ہے آپ کے سارے بچے آپ کی فکری نہج کو اپنا لیں۔ لیکن یہ صرف اسی صورت میں ہونا چاہیے جب آپ یہ دیکھیں کہ وہ اس کے لیے مناسب اہلیت رکھتے ہیں۔

تیسری بات یہ ہے اور اسے بھی ایک اصول ہی کی حیثیت حاصل ہے کہ انسانی نفسیات خلا میں نہیں جیتی۔ انسانی طبیعت کچھ تصورات اور شخصیات کے ساتھ وابستگی ہی سے اپنے سفر کا آغاز کرتی ہے۔ اگر آپ اس کی رعایت نہیں کریں گی اور بچوں کو شروع ہی میں ان کی ہمت سے باہر کے دائرے میں رد و قبول کی راہ دکھائیں گی تو وہ فکری انتشار اور عملی انحطاط کا شکار ہو جائیں گے۔

تعلیم کا اصول یہ ہے کہ بچوں کو نیچرل سائنسز ہوں یا انسان سے متعلق علوم، باتیں اسی طرح سکھائی جاتی ہیں جیسے کہ وہ ہر شک و شبے سے پاک ہوں۔ پھر ان کی معلومات کے دائرے کو بڑھاتے بڑھاتے اس پوزیشن میں لے آتے ہیں

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

کہ وہ دلائل کی کمزوری اور قوت کو سمجھنے لگ جاتے ہیں۔اس کے بعد اگر ان میں اہلیت ہو تو وہ خود دریافت کرنے یا ترجیح دینے کے عمل میں کارکردگی دکھانے لگ جاتے ہیں۔ ورنہ ان کا سفر معلوم کے معلوم ہونے تک محدود رہتا ہے۔

مذہب میں بھی یہی صورت ہو گی۔ بچوں کو آپ اپنے دینی خیالات اسی طرح سکھائیں گی جیسے کہ وہ ایک حقیقت ہیں۔ پھر انھیں مختلف افکارونظریات سے آگاہی کا موقع ملے گا۔ یہ وہ وقت ہے جب آپ کو انھیں یہ سکھانا بھی ہے اور اس کا نمونہ بھی بننا ہے کہ ہر بات دلیل کی بنیاد پر مانی اور رد کی جاتی ہے۔

مذہب کے حوالے سے یہ حقیقت بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ مذہبی استدلال اور تجرباتی علوم کے استدلال میں فرق ہے۔ لہٰذا اس فرق کو اگر ملحوظ نہ رکھا جائے تو فکری نتائج بڑے مسائل پیدا کر سکتے ہیں۔ نیچرل سائنسز کے غلبے کے اس زمانے میں بعض ذہین لوگ اسی فکری تضاد میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں اور انھیں اس سے نکلنے میں بہت مشکل پیش آتی ہے۔ ذہن کا خاصہ یہ ہے کہ اسے نئی بات میں کشش محسوس ہوتی ہے۔ مذہب اللہ تعالیٰ کی سکھائی ہوئی باتوں کو ماننے کا نام ہے۔ دین کی تعلیم کا کام کرنے والوں کو اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ کر معاملہ کرنا چاہیے۔

بچے اپنے والدین اور اساتذہ کو آئیڈیالائز کرتے ہیں۔ آپ بچوں کی تربیت کرتے ہوئے اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالیے گا۔ بلکہ اسی کو استعمال کرتے ہوئے ان کی تربیت کا کام کیجیے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے مقصد میں کامیابی عطا فرمائیں۔ آمین (طالب محسن)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اسلام میں عورت اور مرد کا فرق

سوال: اسلام مساوات کا مذہب ہے۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ عورت کو مرد سے آدھی وراثت ملتی ہے اور شوہر کو بیوی کو مارنے کا حق دیا گیا ہے۔ کئی غیر مسلم قرآن کے اس حکم کا حوالہ دیتے ہیں۔ کیا آپ ان تصورات کی وضاحت کریں گے؟ (بسمہ نور)

جواب: اسلام کی تعلیمات کو سامنے رکھیں تو مساوات کے بجائے عدل کا لفظ زیادہ صحیح ہے۔ مساوات سے بھی وہی مساوات مراد ہے جو عدل کے مقصد سے مطابقت رکھتی ہے۔ آپ نے قرآن مجید کی جن دو تعلیمات پر اشکال ظاہر کیا ہے، ان کا تعلق اسلام کے پیش نظر خاندانی نظام سے ہے۔

جس طرح کسی بھی نظام میں مناصب اہلیت کی بنا پر دیے جاتے ہیں اسی طرح خاندان میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ ایک تو اللہ تعالیٰ نے عورت اور مرد کی شخصیت میں کچھ فرق رکھا ہے۔ دوسرے اسلام میں کفالت کا ذمہ دار مرد کو ٹھیرایا گیا ہے۔ ان دو سبب کے تحت مرد کو گھر کا سربراہ قرار دیا گیا ہے۔ جس طرح ہر نظام میں سربراہ کو تادیب

کے اختیار حاصل ہوتے ہیں اسی طرح گھر کے اس باس (Boss) کو تادیب کا اختیار حاصل ہے۔ قرآن مجید میں یہ ساری بات ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ. (النساء۴: ۳۴)

''مرد عورتوں پر قوام ہیں اس وجہ سے اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے کہ انھوں نے اپنے مال خرچ کیے۔''

شوہر کو بیوی کا باس (Boss) قرار دینے کی وجہ بیان کرنے کے بعد قرآن مجید نے اچھی بیوی کی دو صفات بیان کی ہیں: ایک یہ کہ وہ فرماں بردار ہوتی ہے اور دوسرے یہ کہ گھر کے بھیدوں کی حفاظت کرتی ہے۔ اس کے بعد قرآن مجید نے اگر بیوی شوہر کی اس حیثیت کو ماننے سے انکار کر دے تو اصلاح کے لیے نصیحت، بستر سے علیحدگی اور بدرجۂ آخر مارنے کا طریقہ اختیار کرنے کی ہدایت کی ہے۔

اگر اللہ کے دین میں دیا گیا خاندانی نظام پیش نظر ہو تو اس میں یہ ساری باتیں معقول ہیں۔ البتہ اگر خاندانی نظام کے بجائے معاشرے کو کسی دوسرے طریقے پر استوار کرنا پیش نظر ہے تو پھر نہ ان ہدایات کی ضرورت ہے اور نہ کسی خصوصی اختیار اور حیثیت کی۔

قانون وراثت کے ضمن میں عرض ہے کہ اس کی اساس خود اللہ تعالیٰ نے بیان کر دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ وراثت کے یہ احکام اس لیے دیے گئے ہیں کہ تم خود سے بالعموم ٹھیک ٹھیک متعین نہیں کر سکتے کہ مرنے والے سے منفعت میں سب سے زیادہ کون قریب ہے۔ اس لیے ہم نے خود سے حصے مقرر کر دیے ہیں۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ مرد کو کفیل ٹھہرایا گیا ہے۔ چنانچہ اولاد کی مردوں پر آیندہ کفالت کی ذمہ داری ہے، لہٰذا انھیں زیادہ حصہ دیا گیا ہے۔ اسی قانون میں ماں باپ کا حصہ برابر ہے۔ حالانکہ ان میں بھی ایک مرد اور ایک عورت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب اس پر معاش کی ذمہ داری کی وہ صورت نہیں ہے۔

ہر قانون اور ضابطہ کچھ مصالح اور مقاصد کو سامنے رکھ کر بنایا جاتا ہے۔ قانون پر تنقید کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس مصلحت اور مقصد کو سمجھا جائے۔ دو صورتیں ہوں گی: پہلی یہ کہ ہمیں اس مقصد اور مصلحت ہی سے اتفاق نہ ہو۔ پھر بحث اس موضوع پر ہو گی۔ دوسری یہ کہ اس مصلحت اور مقصد کو یہ قانون پورا نہ کرتا ہو۔ اس صورت میں گفتگو اس دوسرے پہلو سے ہو گی۔ قرآن مجید کا معاملہ یہ ہے کہ یہ علیم وخبیر خداوند عالم کی کتاب ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کی کوئی بات انسانی فطرت اور عقل وفہم کے موافق نہ ہو۔ ہم اپنی کوتاہی دور کر لیں ہر چیز واضح ہو جاتی ہے۔ (طالب محسن)

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net